فہرست مضامین

ماہنامہ —— **الحق** —— اکوڑہ خٹک

محرم الحرام ۱۴۰۶ھ تا ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ **اکیسویں[۲۱] جلد** اکتوبر ۱۹۸۵ء تا ستمبر ۱۹۸۶ء

(مضامین کی یہ فہرست موضوعات کے لحاظ سے ان سلسلہ وار صفحات کے حوالہ سے دی گئی ہے۔ جو ہر صفحہ کے نیچے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ فہرست جلد کے آغاز میں لگوائی جائے (سمیع الحق)

نقش آغاز (اداریہ) سمیع الحق

قرآنیات

دعوات عبدیت حق .... افادات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ

اسلامی قوانین فقہ، اسلامی نظام حکومت و آئین

احکام و مسائل

معاشیات

پارلیمنٹ (قومی اسمبلی اور سینٹ) میں اسلام کا معرکہ

اصلاح وارشاد

مغربی تہذیب، اسلامی تمدن، اسلام اور مغربی دنیا

تعلیم وتربیت، نصاب ونظام تعلیم، تعلیمی ادارے

تاریخ

قادیانیت، انکار حدیث، شیعیت ودیگر فرقِ باطلہ

شخصیات، سیرت وسوانح، وفیات

عالم اسلام (سیر وسیاحت، تاریخ)

* * *

دارالعلوم کے شب و روز

تعارف وتبصرہ کتب

اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لَہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر ڈائرکٹ سسٹم
052317 — 340
341
342

جلد نمبر ۲۱
شمارہ نمبر ۱۲
ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ
ستمبر ۱۹۸۶ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر : سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ	۴۰/- روپے	بیرون ملک	بحری ڈاک چھ پونڈ
فی پرچہ	چار روپے	بیرون ملک	ہوائی ڈاک دس پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نقشِ آغاز

محرم الحرام کے آغاز میں ایک خاص منصوبہ بندی، سیاسی تحرکات اور گروہی تعصب
اور غیر ملکی مفادات کے تحفظ کے پس منظر میں ملک کے مختلف مقامات پر جو فسادات ہوئے
اہل سنت والجماعت پر تشدد ہوا، نہتے اور بے گناہ مسلمانوں پر لاٹھی چارج، آنسو گیس کے مسلسل
گولوں سے معصوم بچوں کو تڑپا دیا گیا، مساجد کی بے حرمتی کیگئی، پردہ دار اور باحیا خواتین کی
پردہ دری کیگئی، انتظامیہ یہ سارا کھیل کھیلتی رہی مگر انصاف کے دروازے پر جوں تک
نہیں رینگی، شاید ہی کوئی مسلمان ہو جو محرم کے تازہ واقعات بعض مقامات پر انتظامیہ کے
ظالمانہ کردار، سراسر جانبدارانہ طرز عمل پر خون کے آنسو نہ رویا ہو، حکومتی مصالح قواعد و ضوابط
اور قیود و حدود اگرچہ اکثریتی طبقہ اہل سنت اور ان کے ترجمانوں کو آہ کرنے کی اجازت نہیں
دے رہے مگر مدیر الحق مولانا سمیع الحق نے کسی نہ کسی طرح ایک تحریک استحقاق کی آڑ لیکر
سینٹ کے پہلے دن کروڑوں سواد اعظم اہل سنت والجماعت کی آواز، انصاف کی سب سے
بڑی پارلیمانی عدالت ایوان بالا سینٹ میں ملک کے ارباب بسط و کشاد تک پہنچاتے ہوئے
انصاف کی درخواست کی، ممبران پارلیمنٹ کو احساس ذمہ داری یاد دلایا گیا، ارباب اقتدار
کو جھنجوڑا، ایوان میں مظلوموں کی ترجمانی کی، عظمت و ناموس صحابہؓ کا دفاع اور اہل اسلام
کے مساجد کے حرمت و تقدس کا علم بلند کیا جو ارباب اختیار پر گویا اتمام حجت ہے۔ اسکی
رپورٹنگ جیسا کہ چاہیئے تھا پریس میں نہ آسکی تاہم یہاں ذیل میں ۱۸ ستمبر کے سینٹ سکرٹریٹ
کی رپورٹنگ کے حوالہ سے ایوان بالا (سینٹ) میں اس زیر بحث مسئلہ کے چند قابل اشاعت
حصے پیش خدمت ہیں:۔

مولانا سمیع الحق | جناب چیئرمین! اگرچہ میری دو تحریک استحقاق ہیں۔ ایک تو
مساجد کی بے حرمتی کے متعلق ہے اور دوسری شریعت بل کے بارے میں ٹیلیویژن سے
مخالفانہ پروپیگنڈہ کے بارے میں۔ اگر ضابطہ کے مطابق آج صرف ایک پیش کرنیکی
اجازت ہے تو میں پہلے تحریک کو ترجیح دونگا۔ اس سلسلہ میں، میں نے جناب اقبال احمد

خان وزیر قانون سے بات چیت کی تھی انہوں نے بھی کہا تھا کہ پیش کرنے میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اس کے بعد مولانا سمیع الحق نے تحریک التواء پیش کرتے ہوئے فرمایا :۔

تحریک استحقاق | میں تحریک پیش کرتا ہوں کہ

ایوان میں میرے استحقاق سے متعلق اس مسئلہ کو زیر غور لایا جائے۔ جناب چیئرمین ! پچھلے ایک ہفتہ میں ملک کے مختلف مقامات پر مقامی انتظامیہ نے بعض ایسے اقدامات کئے جس سے مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات، مساجد (جو خدا کے گھر اور مسلمانوں کے آخری پناہگاہ ہیں) کی انتہائی بے دردی سے بے حرمتی کیگئی اور خانہ خدا کے عظمت و تقدس کو پاش پاش کر دیا گیا اور وہاں موجود نمازیوں کو عبادت کرنے سے محروم کر دیا گیا، چکوال میں وہاں کی جامع مسجد مدنی میں پولیس نے قریب کے سکول کی چھت پر سے مسجد کے اندر اندھا دھند آنسو گیس کے گولے پھینکے، جس کے بعد مسجد میں موجود لوگوں کو بسوں اور گاڑیوں میں بھر کر نامعلوم مقام پر پہنچا دیا گیا، فجر کی اذان اور نماز مسجد میں نہ ہوسکی، اسی طرح لیہ، تلہ گنگ، جہلم اور دینہ کی مساجد کی بے حرمتی ہوئی اور کئی مساجد تین دن سے سیل کر دیگئی ہیں، جہاں نہ نماز ہوسکی نہ اذان، ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔

جناب چیئرمین ! ایک اسلامی مملکت میں جیسے بھی اور جتنے بھی نازک حالات کیوں نہ ہوں، مساجد کی حرمت میں دخل اندازی، مساجد کو عبادت کے لئے بند کرنا اور نمازیوں کو وہاں جمع ہونے سے روکنا، اسلامی احکام سے صریحاً انحراف ہے، مساجد سے متعلق ان اقدامات سے ملک کے کروڑوں مسلمانوں کے اور خود میرے جذبات و احساسات شدید مجروح ہوئے ہیں، اس لیئے استحقاق کے اس مسئلہ کو ایوان میں زیر غور لایا جائے

مولانا کی اس پُر درد اور کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کے ترجمانی پر مبنی تحریک استحقاق پر شاید ہی کوئی پتھر دل انسان ہوگا جس کے جذبات میں ہمدردی کی انگیخت نہ ہوئی ہو۔ سینٹ کے قائمقام چیئرمین جناب ملک محمد علی صاحب نے مولانا کی تحریک استحقاق پر وزیر انصاف جناب اقبال احمد خان کو اظہار خیال کی دعوت دی مگر حیرت ہوئی کہ ان کی تقریر سے پہلے بغیر کسی ضابطہ کے جناب سردار خضر حیات خان بیٹھے بیٹھے بول پڑے اور ایک بے بنیاد الزام داغ دیا کہ " چکوال کی مساجد میں کوئی بے حرمتی

نہیں کیگئی بلکہ وہاں سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو اسلحہ رکھے ہوئے تھے اور وہ مسجد سے لوگوں کو قتل کرنا چاہتے تھے، مسجد ایک منٹ کیلئے بند نہیں کیگئی۔

اخبارات کی اطلاع تو پوری قوم کے سامنے ہے، واقعات اور حقائق کیسے اور کب چھپائے جا سکتے ہیں، مدنی مسجد میں وہاں قرآن کے اساتذہ، دارالحفظ کے بیگناہ طالب علم اور ان کی نگرانی اور انتظامی امور کے چند خادم ـــــ یہی وہ افراد تھے جن کو جناب سردار خضر حیات نے مسلح اور قاتل قرار دیکر صداقت کا منہ چڑھایا۔

جناب مولانا سمیع الحق نے اس موقعہ پر بھی جذباتی اور انتقامی بات کی بجائے اصولی اور قانونی موقف اختیار کرتے ہوئے جناب چیرمین اور وزیر قانون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا!

جناب والا! کیا اس تحریک کا جواب دینا کسی ممبر کا کام ہے؟ جب ابھی ایک چیز کا جو فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ یہ باضابطہ ہے یا غلط، اس وقت تک کیا آپ ایک ممبر کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اس انداز میں کسی معاملے کی تردید کرے یا یہ غلط ٹھہرائے اور مجھے ثبوت کے لئے کہے کہ میں ثبوت پیش کروں۔

وزیر عدل جناب اقبال احمد خان نے مولانا سمیع الحق کی اس تحریک کو دوسرا رخ دینا چاہا، وہ اسے فرقہ واریت سے حل کر کے ڈائنامیٹ کرنا چاہتے تھے، وہ فرقہ واریت کی لایخل بحث چھیڑ کر بے حرمتی مساجد کے شرمناک کردار پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے، ان کے انداز گفتگو سے عدل و انصاف کم اور انتظامیہ کی صفائی زیادہ ٹپکتی تھی، چنانچہ محرک استحقاق مولانا سمیع الحق نے پوائنٹ آف آرڈر پر فوراً کھڑے ہو کر پارلیمنٹ کے ایوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

جناب والا! میں نہایت ادب و احترام سے عرض کرونگا کہ میں خود ان جذبات سے متفق ہوں، میں نہیں چاہتا کہ ہم اتنی تفصیلات میں چلے جائیں، یہاں عقیدوں کی فرقوں کی کوئی بات مناسب نہیں ہے، اس حساس ترین موضوع پر میں صرف اس نکتے پر زور دیتا ہوں کہ مساجد پر پولیس نے یلغار کی، یہ میں نے نہیں کہا کہ کس نقطہ نظر سے، اگر اقبال احمد خان اتنی تفصیلات میں جائیں گے تو وہ مناسب نہیں ہوگا، پھر میں بھی ضرور تقریر کرونگا، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انتظامیہ کو امن کے قیام کے سلسلہ میں اتنا محتاط رہنا چاہیئے تھا کہ کم از کم مساجد کی بے حرمتی تو نہ ہوتی، تین تین مساجد سیل رہیں ان کی تفصیلات آرہی ہیں، اخبارات بھرے ہوئے ہیں

ان میں اذان نہیں ہوئی — اس مرحلہ پر صرف میں اس پوائنٹ پر بات کرنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ بھی حالات ہیں، فرقے موجود ہیں اور ہمیشہ ہونگے لیکن عبادت گاہوں کا تقدس — وہ تو کبھی انگریز کے زمانے میں بھی اس قدر بیدردی سے مجروح نہیں ہوا کہ مسجد میں پولیس نے گھس کر اور گولے پھینک کر نمازیوں کو نکالا۔ سردار خضر حیات کے خلاف واقعہ الزام کا جواب دیتے ہوئے مولانا سمیع الحق نے فرمایا

جناب والا! ممبر قومی اسمبلی جنرل جیلہ ملک اور وہاں کے اسمبلی کے ممبران نے خود تردید کردی ہے کہ وہاں کسی کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ سردار خضر حیات کے پاس سوائے ایک بڑ کے اور کیا تھا، وہ کیا ثبوت پیش کر سکتے تھے۔ آخر مسجد میں ۱۲، ۱۳ سال کے بچے، قرآن کے حافظ، اسلحہ اور قتل کے عزائم ان پر چسپاں کرنا، کہاں کی انصاف پسندی ہے؟ بالآخر سینیٹ کے چیئرمین کو کہنا پڑا کہ

سردار صاحب! آپ نے جو کچھ کہنا ہے تو پوائنٹ آف آرڈر پر کہیں — اقبال احمد خان، جو ہر مرحلہ پر حکومت کے وکیل اور انتظامیہ کے تحفظ کی ادھار کھائے ہوئے ہیں، اس تحریک استحقاق کے ساتھ اپنے میٹھے بول اور زہر آلود شیریں گفتاری سے وہی معاملہ کرنا چاہتے تھے جو وہ روز اول سے شریعت بل کے ساتھ کر رہے ہیں، چنانچہ مولانا سمیع الحق کے جواب میں کہنے لگے کہ

" میں بدقسمتی سے مجبور ہوں۔ یہ کہہ دینے پر کہ اس تحریک کا تعلق صوبائی مسئلہ سے ہے اور یہ سراسر صوبائی مسئلہ ہے۔ یہ رول ۵۹ (۲) اور ۳ کے تحت اِن ایڈمیسبل INADMISSIBLE ہے اور اسکو رول آف آرڈر قرار دیا جائے۔

مولانا سمیع الحق نے وزیر موصوف کی موقعہ پر تردید کی اور قانونی دفعات کا سہارا لینے کے بجائے واقعاتی حقائق اور سچے واقعات پر توجہ دلائی اور توہین مساجد کو صرف صوبائی معاملہ قرار دینے سے اختلاف کرتے ہوئے اسے وفاقی اور آفاقی مسئلہ قرار دیا، چنانچہ ایوان سے خطاب کرتے ہوئے مولانا سمیع الحق نے فرمایا:۔

محترم جناب! میرا الزام انتظامیہ پر ہے خواہ وہ شیعہ ہے یا سنی ہے کوئی قید نہیں انتظامیہ نے جابرانہ انداز میں، مساجد پر جو یلغار کی اور وہاں گھسے اور مسجدوں کو بند کرایا، اس پر میرا اعتراض ہے۔ یہ مسئلہ میرے نزدیک صوبائی نہیں ہے اور نہ یہ وفاقی ہے بلکہ یہ آفاقی ہے، یہ پورے مسلمانوں کے جذبات کا اور عقیدے کا مسئلہ ہے، مساجد کا تقدس برقرار رکھا جائے اس کے بارے میں پورے عالم اسلام کے مسلمان بھی اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں، اگر کسی ایک مسجد کی توہین ہو اس کو اتنا معمولی نہ سمجھیں۔ آپ مجھے تسلی دیں کہ انتظامیہ نے واقعی زیادتی کی ہے، عبادت

خانوں اور مساجد کے ساتھ، تو اس کی تحقیقات کی جائیں گی اور اس کی تلافی کی جائیگی، مجھ سے آپ یہ وعدہ کریں کہ اس بارہ میں پورا ذمہ لیا جائیگا اور مرکز صوبوں سے رابطہ قائم کرے گا۔

اس کے جواب میں وزیر انصاف اور حکومت کے ذمہ دار یقین دلاتے رہے کہ اس کی واقعی تحقیقات کی جائیں گی اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ اب قوم منتظر ہے — کروڑوں مسلمان منتظر ہیں کہ سینٹ کے محترم ایوان میں جو وعدے کئے گئے، جو یقین دہانی کرائی گئی، عملاً اس سلسلہ میں پیش رفت کب ہو گی ..

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب مرحوم

سابق مدرس دار العلوم حقانیہ

۲۵ ر رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ کو دین کے ایک مخلص خادم دار العلوم حقانیہ کے سابق استاذ جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا عبدالغنی صاحب دیروی بھی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ۱۹۱۸ء کے ٹاٹ بھاگ موضع ستھانہ ضلع دیر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولانا حیدر علی تھا۔ نسباً آپ پٹھانوں کی اتمان خیل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور پھر اپنے چچازاد بھائی مولانا محمد حسن سے حاصل کی۔ ۱۳۴۹ھ میں مرکز علم دار العلوم دیوبند پہنچے۔ چونکہ مبتدی تھے اس لئے دار العلوم دیوبند میں امداد کے مستحق نہ ہو سکے۔ لہذا مدرسہ صدیقیہ دہلی میں داخل ہو گئے۔ اور ایک سال تک مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی، حال صدر وفاق المدارس العربیہ و مدرس جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی۔ سے تعلیم حاصل کی۔

۱۳۵۰ھ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ڈابھیل میں داخل ہوتے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری کی صحبتوں اور زیارتوں سے بھی مشرف ہوئے۔

۱۳۵۱ھ میں میرٹھ میں مولانا عبدالرحمن ہزاروی سے استفادہ کیا۔ ۱۳۵۴ھ میں باقاعدہ طور پر دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی۔ مولانا میاں اصغر حسین صاحب۔ مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا مفتی محمد شفیع سے دورۂ حدیث پڑھا، علم حدیث کی تحصیل تکمیل کی۔ فراغت کے بعد قومی مدرسہ علی گڑھ میں مختلف علوم و فنون کی منتہی کتابیں پڑھائیں۔ تقسیم ملک پر ۱۹۴۷ء

میں وطن تشریف لائے۔ ۱۳۷۰ھ میں دارالعلوم حقانیہ میں تدریس کے لئے آپ کی تقرری ہوئی۔ مختلف علوم وفنون اور معقولات کی اونچی کتابوں میں آپ کو درک حاصل تھا۔ آپ کے اخلاق حسنہ، تواضع، ملنساری، طلبہ پر شفقت اور عام معاملات میں اکابر کا پرتو تھا۔ تمام عمر درس تدریس اور خدمت واشاعت دین میں گذار دی۔ سامراج دشمنی اپنے اکابر کی طرح گھٹی میں پڑی تھی۔ درس کے دوران کسی بھی مناسبت سے سامراج دشمنی کا ذکر چل پڑتا تو آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ایسا محسوس ہوتا کہ گویا ذاتی دشمن مدتوں کی انتظار کے بعد آج پاؤں تلے آگیا ہے۔ بقول استاد محترم مولانا سمیع الحق مدیر الحق کے کہ:۔ "ہمیں اس وقت حیرت ہوتی جب مرحوم دنیا بھر کے سیاسی انقلابات، ایشیا، افریقہ، امریکہ بغرض یورپ کے کسی خطہ میں کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتا مولانا مرحوم اس کے پورے سیاسی پس منظر اور ما لہ وما علیہ پر مکمل عبور حاصل ہوتا۔ تدریس میں عمق، استدلال اور انداز گفتگو سادہ اور دلنشین ہوتا تھا۔ ۲۰ سال تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۹۰ھ میں ہوتی کے نوابوں نے اکبر دارالعلوم کے نام سے مردان کے قریب ایک مدرسہ قائم کیا۔ حضرت علامہ شمس الحق افغانی اس کے سرپرست اور مدرس مقرر ہوئے۔ حضرت افغانی چونکہ آپ کے استاد تھے تو ان کے شدید اصرار کے پیش نظر آپ انکار نہ کر سکے۔ لہذا آپ دارالعلوم حقانیہ سے اکبر دارالعلوم منتقل ہو گئے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی مدارس وزارتوں، دنیا و دولت کی فراوانیوں جاہ ومنصب اور نوابی وسرمایہ داری سے نہیں چلتے بلکہ دل کی لگن۔ فقر واستغناء، اخلاص وللہیت اور بوریہ نشینوں کی برکت سے قائم اور مستحکم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکبر دارالعلوم ناکام ہو گیا۔ تو مولانا عبدالغنی قرب وجوار کے دیگر مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ تاہم دارالعلوم اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ، سے وہی خادمانہ، مخلصانہ اور والہانہ تعلق قائم رکھا۔

۲۵ رمضان المبارک کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ گو مرحوم نہیں رہے مگر ان کے سینکڑوں علماء وفضلاء ان کے تلامذہ کی صورت میں ایک ایسا عظیم صدقہ جاریہ ہیں جن کے ہر عمل خیر میں ان کا برابر کا حصہ ہے۔

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب علی گڑھ

اسلامی تمدن میں علم کی روایت اور اس کے متعلقہ مسائل
علم کی حفاظت کے لئے مسلمانوں کی جان توڑ کوشش

قرآن کریم کی نسبت سے فن خطاطی کو بڑا عروج نصیب ہوا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی مصحف کے صدقے میں یہ فن ایجاد ہوا، اور اس نے اسی کے توسط سے ارتقا کے منازل طے کئے، دراصل خطاطی و خوشنویسی ہمارے رسم خط کی تخصیص ہے ورنہ دنیا کے تمام رسم خطوں کا مقصد محض مفاہم کا ضبط تحریر میں لانا ہے۔ یہاں وجہ ہے کہ ہر شخص کی تحریر مختلف ہونے کی وجہ سے تحریر کے ہزاروں لاکھوں نمونے ہر ترقی یافتہ زبان میں مل جائیں گے، لیکن ان میں بذات خود ایسا ہنر نہ ہوگا جس سے علم کے اصول منضبط ہو سکیں، اس کے برخلاف عربی و فارسی رسم خط کی بدولت خطاطی و خوشنویسی کا فن وجود میں آیا، اس میں وسعت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ یہ فن نہایت دقیق علم قرار پایا، اس کے اصول وضوابط مقرر ہوئے، اس کے اقسام الگ الگ خواص قرار پائے، اس طرح جدا جدا مکاتب وجود میں آئے، بے جا نہ ہوگا کہ چند سطروں میں اس کے بارے میں کچھ تفصیل درج کر دی جائے۔

خط عربی ابتداءً سادہ و نسخ تھا، یہی سادگی حضور اکرمؐ کے فرامین میں موجود ہے۔ منجملہ ان کے حضورؐ کا نامہ مبارک ہے، جو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام ہے جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے مجلے میں شائع ہوا، دوسرا نامہ مصر و قبط کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے۔

جو پہلی بار مجلہ الہلال قاہرہ میں ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا حضور اکرمؐ کا فرمان منذر بن ساوی کے نام ہے جو جرمنی کے مجلہ zdmg ج ۱، ۱۸۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا، اسی خط میں دو نمونے پیش میں ہو گئے ہیں۔ یہ ابتدائی سادہ نسخ رفتہ رفتہ خط کوفی سے نزدیک تر ہوتا گیا، چنانچہ اس نسخ ممزوج بکوفی کا قدیم ترین نمونہ قاہرہ میوزیم میں محفوظ ہے، یہ ایک مزار کا کتبہ ہے، جو ۳۱ھ کا ہے، دوسرا کتبہ ۳۲ھ کا ہے، جو بیت المقدس پایا جاتا ہے، ایک تحریر ولید بن ملک ۸۶-۹۶ھ کے عہد کی ملی ہے یہ سادہ خط جو نسخ اور نسخ ممزوج بہ کوفی کے طرز میں ملتا ہے، رفتہ رفتہ تزیینی شکل اختیار کر لیتا ہے، عباسی دور میں خطاطی کی بڑی ترقی ہوئی، خلیفہ مامون کے دور کا بڑا خطاط ابو خالد احول تھا، اس نے خطاطی کے قواعد منضبط کئے، اور اس کی وجہ سے خطاطی کے بہترین نمونے وجود میں آئے، اسی دور کا ایک وزیر فضل بن سہل سرخسی ذو الریاستین تھا، اس کی توجہ سے خط الریاستی رواج پذیر ہوا، یہی خط چار خطوں کا مبدء ہے یعنی ثلث، محقق، رقاع، غبار، تیسری صدی ہجری کے خط کی بہترین یادگار ایک کلام مجید ہے جس کی کتابت ۲۰۲ھ کی ہے، اور دمشق کے میوزیم میں محفوظ ہے، یہ خط کوفی تزیینی میں ہے، آستان قدس مشہد میں ایک قرآن ۳۴۳ھ کا مکتوبہ ہے، یہ کوفی خط میں ہے، جو مائل بہ نسخ ہے، اسی آستانے کا ایک نسخہ سلطان محمود غزنوی کے دبیر ابوالحسن عراقی کا وقف کردہ ہے، جو خط نسخ مائل بہ ثلث میں ہے، چوتھی صدی میں ایک تزیینی خط وجود میں آیا، جس کو بیرآموز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن اس دور میں سادہ خط نسخ بھی رائج تھا، آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں قرآن کا ایک نسخہ خط کوفی مائل بہ نسخ میں ہے، اس کو سلطان محمود غزنوی کے وزیر ابوالقاسم منصور نے ۳۹۳ھ میں وقف کیا تھا، پانچویں صدی کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں تزیینی خط کے علاوہ تذہیب و تنقیش بھی ملتی ہے، اس کے سلسلے میں قرآن کے چند نسخے قابل ذکر ہیں نسخہ قرآن خط کوفی کاتب محمد عثمان وراق غزنوی تاریخ وقف آستان قدس سے ۴۶۶ھ (۲) نسخہ قرآن خط کوفی مائل بہ بیرآموز مجموعہ

چیسٹر بیٹی (۳) نسخہ قرآن خط کوفی باتذہیب کتاب خانہ پیرس مکتوبہ ۵۰۵ھ (۴) نسخہ قرآن خط کوفی باتذہیب کاتب ابوبکر بن احمد بن عبید اللہ غزنوی، مصر میوزیم کتابت ۵۶۶ھ چھٹی صدی ہجری میں خط نسخ میں ریحان، رقاع، توقیع کی آمیزش ملتی ہے، اس کی نمایندگی محمد بن عیسیٰ بن علی نیشاپوری کے قرآن پاک مکتوبہ ۵۸۶ھ سے ہوتی ہے، جو سلطان غیاث الدین محمد بن سام کیلئے تیار ہوا تھا، اور جواب ایران باستان کے میوزیم میں محفوظ ہے۔

اسلامی دور کی خطاطی کی سات سو سالہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے، ابتدا میں نسخ سادہ کا رواج تھا، پھر نسخ آمیختہ بکوفی کا رواج ہوا، پھر کوفی سادہ، پھر کوفی ممزوج بہ نسخ، پھر کوفی تزیینی، اور نسخ تزیینی رواج پذیر ہوئے، لیکن ان میں جو ذرا ذرا سا فرق ہے، اس کے اعتبار کے الگ الگ نام ہوئے، جن کی تعداد پچاس تک پہنچتی ہے، لیکن اوائل تیموری دور میں صرف چھ خط زیادہ متداول تھے، ثلث، ریحان، محقق، نسخ، توقیع، رقاع، اس کے بعد نستعلیق خط وجود میں آیا جو فارسی خط ہے، لیکن اس میں بھی قرآن کریم کے نسخے ملتے ہیں۔

قرآن کریم کی آرائش و زیبائش پر جتنی توجہ ہوئی وہ دنیا کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر سارے ذخیرہ پر نہ ہوئی ہو، ہزاروں فن کاروں نے اپنے ہنر کی نمائش کے لیے قرآن کو منتخب کیا، اس کے نتیجے میں خود قرآن کے ایسے ایسے نادر نسخے وجود میں آئے ہیں جو اسلامی خطاطی کی تاریخ کے لیے اہم مواد کا کام دیتے ہیں، لیکن ابھی خطاطی کی تاریخ اس اہم ماخذ کی روشنی میں لکھی نہیں جا سکی ہے، قرآن مجید کے جتنے نسخے ملتے ہیں، اتنے نسخے دنیا میں کسی ایک . . . . کتاب کا کیا ذکر متعدد کتابوں سے مل کر نہ ہوں گے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن مجید ہے، اور اسی پر سب سے زیادہ ہنر صرف ہوا ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں ایسے ایسے نئے علوم ایجاد ہوئے جن کا نام و نشان بھی

دوسرے تمدن میں نہیں۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں علما اور لاکھوں کروروں کتابیں معرض وجود آئیں جو موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل نادر تھیں، تہذیب انسانی اسلام کے اس احسان عظیم سے گران بار ہے۔

علوم شرعی میں جن امور و مسائل پر علمائے اسلام نے کتابیں تصنیف کیں ان مسائل سے تہذیب بشری دوچار نہیں ہوئی تھی، اس لحاظ سے یہ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب اور اسی اعتبار سے تاریخ بشر پر اسلام کا احسان عظیم ہے، نئے علوم کی دریافت اور ان سے متعلقہ امور کا نہایت درجہ عمیق مطالعہ مسلمانوں کا اتنا عظیم کارنامہ ہے، جس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں مل سکتی، علوم شرعیہ کا یہ رخ حد درجہ قابل توجہ ہے۔

علوم عقلی میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دئے وہ اس لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ پورے عالم میں اس لحاظ سے ان کا کوئی مقابل نہ تھا۔ جب عالم اسلام میں بیت الحکمۃ قائم ہو رہے تھے اور ان میں اہم علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق انجام پا رہی تھی، یورپ تعلیم کے ابتدائی مراحل سے بھی نہیں گذرا تھا، مسلمانوں نے یونانی علوم کو عربی میں اس طرح منتقل کیا، اور اس پر بھرپور اضافہ کر کے ان میں نئی جہتیں پیدا کیں، یونانی علوم کا بیشتر حصہ اصل زبان میں زمانہ کی نذر ہو گیا تھا، البتہ عربی زبان میں وہ سارا کا سارا محفوظ رہا، اور یہی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا موجب ہوا، اہل عرب کو اب سارے عالم کی علمی سربراہی حاصل ہوئی، اور ان کی یہ بالادستی کئی صدی تک قائم رہی، چنانچہ مشرق اور مغرب کے سارے دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر عربوں نے علم کی حفاظت میں ایسی جان توڑ کوشش نہ کی ہوتی تو یورپ ابھی تک ..... دور تاریکی میں ہوتا، تہذیب عالم اسلام کے بار احسان سے کیوں کر سبکدوش ہو سکتی ہے، اب میں جستہ جستہ چند علما کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یونانی علوم نہ صرف محفوظ رہ گئے، بلکہ ان پر اضافے ہوئے، اور ان کی نئے سرے

تجربہ اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا، اس طرح وہ لوگ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب بنے، علوم کی ترقی میں خلفائے عباسی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہمیشہ زندہ اور تابناک رہیں گے،

مشاہیر علمائے ریاضی میں یوں تو کئی نام ملتے ہیں لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ خوارزمی معاصر خلیفہ مامون (۸۴۰ء-۲۱۸ھ) کی ہے، اس کی کتاب حساب کا عربی متن مفقود ہے، لیکن اس کا بارہویں صدی عیسوی کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، اس کی دوسری اہم کتاب کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ موجود ہے، یہ کتاب لاطینی اور انگریزی دونوں یورپی زبانوں میں منتقل ہو گئی ہے، خوارزمی نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے اسلامی نقطۂ نظر کو یورپ سے روشناس کرایا، اہل یورپ اس کو الخوارزم کہتے ہیں۔

خوارزمی کے معاصرین میں محمد بن کثیر فرغانی ہے، جس کے دو رسالے اسطرلاب پر اور ایک کتاب اصول علم نجوم پر ہے، یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

قرن سوم کے دانشوروں میں بنی موسیٰ بن شاکر قابل ذکر ہیں، ان کی ایک کتاب معرفۃ الاشکال البسیطۃ والکریہ موجود ہے، اس کا ایک بیٹا محمد بن موسیٰ ہے، متوفی ۲۵۹ھ جس کی مشہور تصنیف کتاب المخروطات ہے۔

اسی دور کا ایک ریاضی دان ومنجم عمر بن الفرخان الطبری ہے، جس نے کتاب الاربعۃ لبطلیموس العلوذی کی تشریح لکھی ہے، وہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے، اس کی نجوم پر دو کتابیں جوامع الاسرار وکتاب مختصر باقی ہیں۔

اسی صدی کا سب سے مشہور فلسفی یعقوب بن اسحٰق الکندی ہے۔ (۸۷۳ء) اس کے تین سو رسالے موجود ہیں بعض کی اصل عربی باقی ہے، اور بعض کے محض لاطینی ترجمے، اس کی اکثر تصانیف ۱۲ویں صدی میں Geradus Cremonesis کے وسیلے سے لاطینی میں منتقل ہوئی تھیں

کندی یونانی علوم کا زبردست ماہر تھا، اس کے ذریعے اصل علوم تک رسائی ہو سکتی ہے، اس کے شاگردوں میں ابو معشر بلخی (م ۲۷۲ھ) احمد بن طیب سرخسی اور احمد بن سہل بلخی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں یونانی اور دوسری زبانوں کی علمی کتابوں کے ترجمے ہوئے، ان مترجمین میں ثابت بن قرہ حرانی کا نام قابل ذکر ہے، اس نے ریاضی، ہندسہ اور طب کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جو اکثر موجود ہیں۔

اس دور کی طبی تصانیف میں منصور عباسی کے طبیب جرجیس بن بختیشوع کی کتاب الکناش موجود ہے، ابو زکریا یوحنا بن ماسویہ (م ۲۴۳) کی کتاب الحمیات المشجر باقی رہ گئی، حنین بن اسحاق نے یونانی اور سریانی سے طب کی متعدد کتابیں عربی میں منتقل کیں، لیکن تیسری صدی کا سب سے مشہور طبیب ابوالحسن علی بن سہل ابن طبری ہے، اس کی مشہور کتاب فردوس الحکمۃ ہے جو چھپ چکی ہے۔

چوتھی اور پانچویں صدی علوم اسلامی خصوصاً علوم عقلی کی ترقی کا دور ہے، اس دور میں محمد بن زکریا رازی، ابو نصر فارابی، علی بن عباس مجوسی، ابن سینا، ابو ریحان بیرونی، ابن مسکویہ، ابو سہل مسیحی، وغیرہ دانشوروں کی وجہ سے علوم اسلامی نے وہ درجہ حاصل کر لیا، جو اسے کبھی نصیب نہ تھا، اور انہی کی کوششوں سے مشرق کو علم کے میدان میں وہ امتیاز حاصل ہوا جو اسے پھر کبھی نہ ملا، اور اسی کی وجہ سے سارے عالم کی علمی سرمایہ کئی صدی تک مشرق کے حصے میں رہی، طب، حکمت، ریاضی، جغرافیہ، ایسے علوم ہیں جن میں مسلمانوں نے نمایاں درجہ ناموری حاصل کی اس سلسلے کے بعض مشاہیر کا نام درج کیا جاتا ہے۔

حکمائے بزرگ میں محمد بن زکریا رازی، ابو نصر فارابی، ابو سلیمان منطقی، ابن رشد، ابن طفیل، ابو حیان توحیدی، ابن مسکویہ، ابن سینا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علوم ریاضی میں ابو الوفا بوزجانی، ابو جعفر الخازن الخراسانی، ابو سعید احمد بن عبد الجلیل سجزی، عبد الرحمن صوفی، ابو الحسن

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی قابل ستائش ہیں، طب میں محمد بن زکریا رازی، علی بن عباس مجوسی ابوسہل مسیحی جرجانی، ابن سینا کا نام کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، علم جغرافیا میں ابو القاسم محمد بن خرداذبہ ابو القاسم محمد بن حوقل، ابو اسحاق ابراہیم اصطخری شمس الدین مقدسی، ابو عبداللہ احمد بن محمد جیہانی، ابو الحسن علی مسعودی، ابو زید بلخی، ابوریحان بیرونی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

علم تاریخ میں مسلمانوں نے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں، اسلامی تمدن کی برتری کے زمانہ میں بڑے بڑے مورخین گذرے ہیں، ان میں چند کا نام یہ ہے،

ابن اسحاق، سیرت سنہ ۷۶۷ء۔ بلاذری، فتوح البلدان سنہ ۸۹۲ء۔ ابن قتیبہ کتاب المعارف سنہ ۸۸۹ء۔ ابوحنیفہ دینوری، الاخبار الطوال سنہ ۸۹۵ء۔ یعقوبی سنہ ۸۷۲ء / ۲۵۸ھ حمزہ اصفہانی سنہ ۹۶۱ء۔ مسکویہ سنہ ۱۰۳۰ء۔ محمد بن جریر طبری تاریخ الرسل والملوک سنہ ۳۱۰ھ۔ ابوالحسن علی المسعودی مروج الذہب سنہ ۹۵۶ء۔ ابن الاثیر الکامل فی التاریخ سنہ ۱۲۳۴ء / ۶۳۰۔ ابن خلکان وفیات الاعیان سنہ ۶۸۳ھ۔ ابن خلدون سنہ ۸۰۶ھ۔ یاقوت حموی ۶۲۲ھ، ابن خلدون ۸۰۶ھ، ابن عساکر تاریخ دمشق سنہ ۵۷۱ھ۔ ابن خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد وغیرہ

ان کے ساتھ فارسی زبان کے چند مورخین کے نام کا اضافہ غیر ضروری نہ ہوگا۔

ابوالفضل بیہقی تاریخ مسعودی۔ گردیزی۔ زین الاخبار۔ عطاملک جوینی، جہان کشا۔ رشید الدین فضل اللہ۔ جامع التواریخ۔

ان کے علاوہ طبقات کے سیکڑوں مولفین کے کارنامے ہیں، جو تاریخ کے اہم ماخذ ہیں، اور جن کے بغیر اسلامی علوم کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترقی میں جو قابل ذکر کارنامے انجام دئے ہیں، ان کا اعتراف اہل مغرب نے بھی کیا ہے، چنانچہ ہٹی جیسے مصنف کو یہ قول دہرانا پڑا،

"بنی نوع انسان کے مخصوص کام مسلمانوں کے توسط سے انجام پذیر ہوئے، عظیم ترین فلسفی الفارابی مسلمان تھا، سب سے بڑے ریاضی دان، ابوکامل اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے، سب سے بڑا جغرافیہ دان اور دائرۃ المعارف بہ صلاحیت کامل مسعودی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مورخ الطبری بھی مسلمان تھا۔"

غرض اسلامی تمدن کی علمی برتری ایسے دانشوروں کے کارناموں کی وجہ سے ہے، جن کی اہمیت آج بھی برقرار ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس تمدن کی سب سے زیادہ قابل توجہ تخصیص کتابوں کی کثرت اور تنوع ہے، تہذیب بشر میں کسی مخصوص قوم کے یہاں نہ اتنے دانشور ملیں گے، نہ ان کے یہاں علوم و فنون میں اتنا تنوع ہوگا، نہ ان کے یہاں اتنا علمی سرمایہ ہوگا، اگرچہ اس علمی سرمایے کا بیشتر حصہ مفقود ہو چکا ہے، اور جو موجود ہے، وہ مفقود حصے کا محض ایک حقیر جز ہے، اگر کسی طرح مفقود اور معلوم سرمایے کا احاطہ ہو سکے تو معلوم ہوگا، کہ کتابوں کی تعداد کئی کروڑ تک پہنچ جائے گی، ان کتابوں کی ایک بڑی خصوصیت ان کی ضخامت ہے، بعض علما کی کتابیں ۸۰ مجلدات سے زیادہ ہیں، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور زکریا رازی کی الحاوی اس زمرے میں آتی ہیں، طبری کی تاریخ الرسل والملوک ۱۵ جلدوں میں لائڈن سے ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء شائع ہوئی ہے، اور اس کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۳۰ مجلدات پر مشتمل تھی، سامانی امیر ابوصالح منصور بن نوح (۳۵۰ھ-۳۶۶ھ) نے دیکھی تو کہا کہ اتنی ضخیم تفسیر کا مطالعہ میرے بس کا نہیں، پھر اس نے ماوراءالنہر اور خراسان کے علما کو جمع کیا، اور اس کے ترجمے کے جواز میں کوئی قطعی فیصلہ چاہا، علما کی ایک جماعت نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر جائز ہے، اس کے چند علما اس کام کے لئے منتخب ہوئے، اور انھوں نے فارسی میں تفسیر طبری کا خلاصہ مرتب کیا، جو ۱۱ مجلدات پر مشتمل تھا۔

امیر خلف بن احمد (م ۳۹۹ھ) سیستان کا نامور حکمران گذرا ہے، جو ۳۹۳ھ میں محمود غزنوی سے شکست پا جاتا ہے، اس کے بعد محمود کا قبضہ سیستان پر مستحکم ہوتا ہے، امیر خلف نہایت سخی اور عادل بادشاہ تھا، علوم کا بڑا قدر دان اور علما و فضلا کا مربی تھا، مشہور مورخ عتبی نے تاریخ یمینی میں اس کے فضائل کے ذکر میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امیر مذکور نے اپنے زمانے کے مشہور علما کو جمع کیا، اور قرآن مجید کی ایک ایسی مفصل و جامع تفسیر لکھنے کی فرمائش کی جو مفسروں کے اقوال، متقدمین و متاخرین کی تاویلات مختلف قرأتوں کے وجوہ اور نحو کے اسباب کے بیان، اشتقاق لغات، امثال و شواہد نظم و نثر، اخبار و احادیث سے آراستہ ہو، راوی لکھتا ہے کہ اس کے مولفین کو بیس ہزار اشرفیاں دی گئیں، اس تفسیر کا ایک نسخہ مدرسہ صابونی نیشاپور میں غزوں کے حملے (۵۴۸ھ) تک موجود تھا، اس کے بعد وہ اصفہان منتقل ہوا، اور آل خجند کے کتاب خانے کی زینت بنا، تاریخ یمینی کے مترجم ابو شرف ناصح جرباذقانی نے اضافہ کیا ہے کہ (اواخر چھٹی صدی ہجری) جب وہ اپنے وطن سے نکل کر اصفہان میں مقیم ہوا، اس نے تفسیر مذکور کا وہ نسخہ دیکھا تھا، سو جلدوں میں تھا، اس کے استنساخ کے لیے ایک عمر درکار ہے، اور اس کام کیلئے نہ جانے کتنے کاتبوں کی ضرورت ہوگی۔

طبری نے علم کی جتنی خدمت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ اس کی ابتدائے تحریر سے موت تک جو حساب کیا گیا تو ۱۴ ورق فی روز کا اوسط نکلا، عبد الرحمن بن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کے بارے میں خود ان کے نواسے کا بیان ہے کہ انھوں نے دو ہزار مجلدات اپنے ہاتھ سے لکھی تھیں اور ہر روز ۴ جز لکھتے اور سالانہ ۴۰ تا ۵۰ جلد ہو جاتے۔

اسلامی تمدن کی برتری کے دور میں کروڑوں کتابیں لکھی گئیں، چونکہ اس زمانے میں پریس نہ تھا، اس لیے قلمی نسخے تیار ہوتے تھے، مخطوطے اچھے برے کئی قسم کے تھے، یہ مخطوطے

جہاں بڑے بڑے خطاطین کے فنی کمال کی نمائندگی کرتے ہیں، وہاں پیشہ ور کاتبوں کی لاپرواہی
داستان اپنی زبان بے زبانی سے دہراتے ہیں، اس طرح لاکھوں کاتب، خطاط، خوشنویس وغیرہ
اس کام پر مامور ہوتے، آپ غور کریں جس معاشرے میں کتابوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہو۔
اور وہ سب کی سب قلمی شکل میں ہوں، اور اکثر و بیشتر کا حجم ہزار صفحے سے زیادہ ہو تو ان کے لئے
کتابت کے کتنے وسائل درکار ہونگے، جس طرح لاکھوں خطاط اس کام میں مصروف ہوتے ہیں
اتنی ہی تعداد میں جدول کش، سیاہی بنانے والے، کاغذ تیار کرنے والے بھی درکار ہوتے، بعد کے
دوروں میں مصور بھی وجود میں آجاتے ہیں، وہ بھی قلمی کتابوں کی توضیح کے لیے ان میں تصویر کشی
کرتے ہیں، غرض لاکھوں کروڑوں فنکاروں کی پیہم کوشش کا نتیجہ اسلامی تمدن کے کروڑوں
مخطوطات ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ تعلیم و تعلم میں مصروف تھا، آپ اگر اس وقت
کے اسلامی ممالک کی آبادی کو ذہن میں رکھیں تو دنیائے تمدن میں جو علمی انقلاب ہوا وہ زیادہ
عبرت آموز معلوم ہوگا۔ اور موجب صد افتخار بھی۔

مخطوطات کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ لاکھوں سے زیادہ مخطوطات ضائع ہو چکے ہیں، اور ان کی وجہ سے بہت سا علم
بھی ضائع ہو گیا۔ نادر مخطوطات کے ساتھ تو نادر علم بھی دفن ہو گیا۔ عام مخطوطے بھی کسی نہ کسی درجے میں
نئی معلومات کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے کوئی دو مخطوطے یکساں نہیں ہوتے، اختلاف نسخ میں علم
روپوش ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی مخطوطات جو باقی رہ گئے ہیں، وہ اپنی کثرت اور تنوع مضامین کے اعتبار سے
دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

۳۔ ہزاروں کتابیں ایسی ہیں، جن کی بنیاد محض ایک ہی مخطوطے پر ہے، ایسے مخطوطے نہایت

درجہ قیمتی ہیں، ان کی حفاظت کی فوری تدبیر ہونی چاہیے۔

۴۔ ہزاروں کتابوں کا محض ایک جز محفوظ رہ گیا ہے۔

۵۔ مصنف کے خود نوشت مخطوطے خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن ان کے مقابلے میں جو ضائع ہو چکے ہیں، بہت زیادہ ہیں، اس لیے تقریباً ہر مصنف کوئی نہ کوئی مسودہ ضرور تیار کرتا ہے، اس لحاظ سے خود نوشت مخطوطات کی تعداد مصنف کی تعداد سے کم نہ ہونا چاہیے، لیکن موجود اور مفقود میں ایک اور ہزار کی نسبت سے بڑی نسبت ہوگی۔

۶۔ اسلامی دور کے مصنفین اور قارئین کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مخطوطات پر دوران مطالعہ اپنی یادداشت ثبت کرتے رہے ہیں، اس سے مخطوطہ کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوتا تھا، ذیل میں بعض چند ایسے مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے جو یا تو خود نوشت مخطوطے ہیں، یا اہم مصنفین کی یادداشت سے مزین ہیں، یہ مثالیں محض نمونۃً ازخروارے ہیں:

کتاب تفسیر غریب القرآن علی حروف المعجم، تالیف ابوبکر محمد بن عمر بن احمد بن عزیز السجستانی (م ۳۳۰ھ) اس کو مشہور مصنف ابن الجوالیقی (م ۵۳۹ھ) نے ۵۱۴ھ میں پڑھا، مخطوطہ مکتوب ۴۹۹ھ میں، پھر زید بن حسن بن زید الکندی (م ۶۱۳ھ) کی یادداشت کے مطابق ربیع الثانی ۶۰۰ھ میں اس کے مطالعے میں رہا۔ (چسٹر بیٹی، ڈبلن، پلیٹ نمبر ۱)

النہایہ فی غریب الحدیث تالیف مجد الدین ابوالسعادات المبارک بن محمد بن الاثیر الشیبانی الجزری (م ۶۰۶)، مؤلف کا خط (چسٹر بیٹی نمبر ۳)

حلیۃ الابرار تالیف محی الدین ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶)، اس کی کتابت خود ان کے شاگرد علی بن ابراہیم بن داؤد بن العطار نے ۶۷۲ھ میں کی۔ (ایضاً: نمبر ۶)

کشف الالہام، تالیف بدر الدین ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الشبلی بن قیم الشبلیہ (۷۱۲ھ - ۷۶۹ھ) خود مؤلف کا نسخہ، کتابت رجب ۷۳۸ھ (ایضاً: نمبر ۷)

ہدایۃ الساری لفتح الباری، تالیف شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی الکنانی (م: ۸۵۲) کی کتابت سنہ ۸۸۸ھ میں مشہور محدث القسطلانی (م: ۹۲۳) نے کی۔ (ایضاً نمبر ۱۲)

ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م: ۲۷۰) تاریخ کتابت محرم سنہ ۵۴۳ھ کاتب جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی (وفات سنہ ۵۹۷ھ) عالم اسلام کی اس عظیم المرتبت شخصیت نے ۳۳ سال کی عمر میں اسے نقل کیا تھا۔ (ایضاً: نمبر ۴۲)

احیاء علوم الدین کا یہ نسخہ سنہ ۵۰۲ھ اور سنہ ۵۷۷ھ میں مشہور مورخ احمد بن یوسف بن الازرق کے مطالعہ میں رہا۔ (نمبر ۴۳)

کتاب شفاء الصدور، تالیف ابو بکر محمد بن حسین بن زیاد المعروف بالنقاش، اس نسخے پر دو یادداشتیں ہیں، ایک شوال سنہ ۵۳۱ھ کی جو ابو البرکات بن المبارک الانماطی (م: ۵۳۸) استاذ ابن الجوزی کے خط میں اور دوسری سند مالک مخطوط کی ہے، جو عبد المالک بن سعید کے بیٹے تھے۔ (م: ۵۶۰) (نمبر ۴۶)

کتاب الفوائد، تالیف ابو بکر بن عبید اللہ بن محمد بن الشاکر السیرانی (م: ۳۷۸) کے کاتب ابن عساکر مؤلف تاریخ دمشق ہیں، اس پر متعدد یادداشتیں ہیں، سنہ ۵۹۶ھ کی تحریر ابن عساکر کے پوتے علی بن القاسم (م ۶۱۶) کی ہے۔ (نمبر ۵۰)

مشارق الانوار، تالیف حسن بن محمد بن حسن الصغانی (م: ۶۵۰) پر خود مصنف کی یادداشت ہے۔ اس کا کاتب عبد اللہ بن محمد بن ابی بکر الغسانی الاندلسی ہے، اس کو خود مصنف کے گھر پر مختلف علماء نے پڑھا، صغانی اصلاً لاہوری ہیں۔ (نمبر ۵۱)

ترجمۂ اقلیدس نصیر الدین طوسی کے شاگرد نجم الدین علی بن عمر قزوینی کے خط میں ہے۔ (نمبر ۵۴)

اطراف الصحیحین تالیف ابو نعیم عبید اللہ بن الحسن بن احمد بن الحداد الاصفہانی (م: ۵۱۷) خود مؤلف کے خط میں مکتوبہ سنہ ۵۱۱ھ۔ (نمبر ۵۵)

اختیار الاکابر تالیف شمس الدین السخاوی (م: ۹۰۲) اس کے کاتب ابوبکر بن عبدالرحمن بن محمد بن ابی بکر بن عثمان بن محمد السخاوی الشافعی (م: ۹۹۳ھ) برادر مؤلف۔ (نمبر ۵۹)

ابن القلقشندی (م: ۸۷۱) کے خطبات کا مجموعہ جو ربیع الثانی سنہ ۸۳۳ھ میں مسجد جامع ازہر مصر میں دیئے گئے تھے۔ (نمبر ۶۰)

ابوخیثمہ زہیر بن حرب النسائی الشیبانی (وفات سنہ ۲۳۴ھ) پر ابن حجر عسقلانی (م: ۸۵۲) کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو مجد الدین بن ابراہیم کے ساتھ پڑھا، اور سخاوی کی ایک تحریر سے واضح ہے کہ انھوں نے اس نسخے کو ۱۳ رجادی الثانیہ سنہ ۸۵۲ھ میں ابن حجر کے ساتھ مطالعہ کیا۔ (نمبر ۶۳)

اس نسخے میں سخاوی کے خط میں ان کے متعدد معاصرین کے نام ہیں، جو خود صاحب تصنیف بزرگ ہوئے ہیں۔ (نمبر ۶۵)

ابن قتیبہ کی غرائب الحدیث، کتابت سنہ ۴۷۹ھ، جو عبدالعزیز بن الحسین بن علی الزہری کے مطالعہ میں سنہ ۵۳۲ھ میں رہی۔ (نمبر ۶۸)

دارقطنی الحافظ (م: ۳۸۵) کی کتاب المجتنیٰ من السنن المنظمہ کے کاتب عبداللہ بن ابراہیم بن مظہر الدقاق (م: ۶۱۹) ہیں۔ اس پر متعدد فضلاء کی تحریریں ہیں، عماد الدین ابواسحاق ابراہیم بن عبدالواحد بن علی بن سرور المقدسی کے مطالعہ میں یہ نسخہ سنہ ۵۸۸ھ میں رہا، دوسری یادداشت شوال سنہ ۶۰۱ھ کی ہے۔ خط عبدالرحیم بن عبدالواحد بن احمد المقدسی کا، اور ضیاء الدین محمد المقدسی (م: سنہ ۶۴۳ھ) استاد تھے کا اس لیے ان کا نام موفق الدین ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (م: ۶۲۰) تھا، ایک شاگرد ابوالفتح محمد بن عبدالغنی الجماعیلی (م ۶۱۳) پسر عبدالغنی المقدسی الجماعیلی (م: ۶۰۰ھ) (نمبر ۷۰)

مخطوطہ نمبر ۳۶۶۴ بخط تقی الدین ابوبکر بن محمد بن ابی بکر البسطامی الحلبی، معروف بہ ابن الحبیش، شاگرد سخاوی، یہ مخطوطہ سخاوی کی بھی تحریر سے مزین ہے۔ (نمبر ۹۱)

جمال الدین ابو الفرج ابن الجوزی (م : ۵۹۷) کی تنظیم کا مخطوطہ احمد بن عبد الرحمن بن احمد بن عبد الرحمن ابن علی بن یحییٰ بن محمد الشہر زوری کے خط میں ہے، (وفات ۷۰۱) (نمبر ۱۱۰)

ابن فارس (م : ۳۹۵) کے تتمہ فصیح الکلام کا مخطوطہ یاقوت بن عبد اللہ الرومی الحموی (م : ۶۲۶) کے خط میں (نمبر ۱۳۴) مخطوطہ نمبر ۳۹۹۹۔

اسی مخطوطہ کے جزاول پر یاقوت الحموی کی سنہ ۶۲۰ھ کی تحریر ہے، جس کی تصدیق ابن شداد نے کیا ہے (ابن شداد کے لیے دیکھئے بروکلمن)

مختصر کتاب العین الزبیدی، علامہ بقائی کے خط میں، احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے میں۔

شرح جوالیقی، ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م سنہ ۲۷۶ھ) شارح کے بیٹے اسماعیل کے خط میں مورخ سنہ ۵۵۳ھ (ویانا میں)

ابن الاثیر کی البسیط، نسخہ قاہرہ پر مؤلف کی یادداشت موجود ہے۔

منتخب نزہۃ الالباء، عبدالعزیز بن جماعہ کے خط میں، احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے کا نسخہ۔

ابن شاکر کی عیون التاریخ کی بارہویں اور بیسویں جلدیں خود مصنف کے خط میں احمد زکی پاشا کے کتاب خانے میں ہیں۔

ابو عبید القاسم بن سلام کی تالیف، کتاب الاموال پر ذیل کا نسخہ بخط مؤلف علی ابن ایوب مقدسی احمد زکی پاشا کے یہاں ہے۔

"تاریخ النساء" تالیف یاسین العمری الموصلی خود مؤلف کے خط میں، احمد زکی پاشا کے کتب خانے میں ہے۔

کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ، تالیف ابو منصور موفق ہروی کا واحد نسخہ، فارسی کے مشہور شاعر اسدی طوسی (م: ۴۶۵) کے خط میں ویانا میں ہے، اس کی تاریخ کتابت سنہ ۴۴۷ھ ہے، اور اس لحاظ سے فارسی زبان میں سب سے قدیم مخطوطہ ہے، خط نسخ مائل بہ کوفی میں ہے۔

ترجمان البلاغہ، تصنیف محمد بن عمر الرادویانی نسخہ منحصر بفرد کتب خانہ فاتح استنبول میں موجود ہے، اس کی کتابت سنہ ۵۰۷ھ میں ہوئی، کاتب ابوالہیجاء اردشیر بن دلیار القطبی شاعر ہے، جس کے مشورے سے اسدی طوسی نے لغت فرس لکھی تھی، ترجمان البلاغہ مدتوں فرخی سیستانی کی تصنیف سمجھی جاتی رہی ہے،

وفیات الاعیان تالیف ابن خلکان (۶۸۳) کا نسخہ متحف برطانیہ بخط مولف ہے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے فضلاء نے قلمی نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کیے، مطالعہ کے دوران ان پر یادداشتیں لکھیں، ان سے نہ صرف مخطوطات کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ وہ خود ادبی تاریخ کے ماخذ کا کام کرتی ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان مخطوطات کا بیشتر حصہ برباد ہو چکا ہے، ابن ندیم کی روایت ہے کہ جو کتابیں دستبرد زمانہ سے بچی ہیں، جو ہزار میں ایک کی نسبت سے ہیں، یہ چوتھی صدی کی بات ہے، اگر اس کو انتہائی مبالغہ پر محمول کیا جائے تو شاید سو اور ایک کی نسبت میں مبالغہ نہ ہو، یہ تو حملہ تاتار سے پہلے کا حال ہے، اس سانحے سے اسلام کے مشرقی حصے کو جو جانی، مالی، علمی، تہذیبی نقصان پہونچا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ایک طرف تو لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تو دوسری طرف سیکڑوں عظیم کتاب خانے نذر آتش ہوئے، اور اس طرح اسلامی علوم کا بڑا سرمایہ ضائع ہو گیا، حملہ تاتار سے اسلامی تمدن کو جو نقصان پہونچا اس کی تلافی ناممکن ہے، کتابوں کے اس عظیم سرمایے سے قطع نظر اس کے بعد کے ادوار کا علمی معیار بھی پست ہو گیا،

مخطوطات کی بربادی میں سیاسی اسباب کے علاوہ اور دوسرے عوامل کا بھی دخل ہوتا ہے، اور سب سے بڑی بات جہل اور عام آدمیوں کی غفلت ہوتی ہے، وہ اچھی اور بری کتابوں میں تمیز نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ اہم مخطوطات کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو کسی غیر ضروری کتاب کے ساتھ ہو، وہ حال ہی کی

بات ہے کہ لاہور کے مشہور پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، اسی دوران میں اس کی پھٹی جلد کے اندران کو کوئی قدیم تحریر نظر آئی، جلد کے اوراق کھولے گئے تو اس سے عنصری کی مفقود مثنوی وامق و عذرا کے خاصے اوراق برآمد ہوئے، پروفیسر صاحب نے ان اوراق کو بڑی توجہ سے پڑھ کر شایع کر دیا، اس طرح ایک گم شدہ کتاب کا پتہ چل گیا۔

ایک عجیب بات ہے کہ مخطوطات کی حفاظت کی ہر چند کوشش کی جائے، مگر وہ زیادہ سود مند نہیں ہوتی، رشید الدین فضل اللہ طبیب غازان خان کا دانشمند وزیر تھا، وہ جامع التواریخ کا مصنف ہے جو عالمی تاریخ نویسی کی زندہ مثال ہے، فضل اللہ کی اور دوسری تصانیف بھی ہیں، اس نے تبریز میں ایک کالونی آباد کی، اس کا نام ربع رشیدی رکھا، اس کا ایک حصہ کاتبوں اور خطاطوں کے لیے وقف تھا، جو اس کی کتابوں کے نسخے تیار کرنے پر مامور تھے، اس طرح اس کی تصانیف کے سیکڑوں نسخے تیار ہو گئے، اس کے علاوہ اس نے ایک تدبیر یہ بھی کی تھی کہ اپنی ساری کتابوں کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں منتقل کرا دیا تھا، لیکن جس وقت پروفیسر براؤن تاریخ ادبیات ایران لکھ رہے تھے، رشید کی کتاب کا کوئی نسخہ مکشوف نہ تھا، بہرحال اس کے چند سال بعد جامع التواریخ کے نسخے ملے، اور اب یہ کتاب شایع ہو چکی ہے، ان کے مجموعہ رسائل کے نسخے بھی مل چکے ہیں، اور ربع رشیدی کا تیار کیا ہوا ایک نسخہ (عربی زبان والا) راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں بھی موجود ہے، اس کی ایک ضخیم کتاب "اسولہ و اجوبہ" ہے، اس کے نسخے بھی مکشوف ہوئے ہیں، ایک نسخہ آثار میوزیم میں بھی تھا، جو اب مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے۔

باوجود اس امر کے کہ اسلامی علوم کا بیشتر خزانہ ضائع ہو چکا ہے، اور جو باقی ہے وہ محض ایک حقیر چیز ہے، اور اس باقی ماندہ چیز کا بڑا حصہ قلمی شکل میں ہے، اور یہ قلمی کتابیں اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی ہیں کہ کسی دوسرے تمدن میں نہ ہوں گی، یہ مخطوطے مشرق اور مغرب کے کتابخانوں میں محفوظ ہیں، مغرب کے بیشتر کتابخانوں کی فہرستیں بھی شایع ہو گئی ہیں، محض یورپ میں قلمی کتابوں کی تعداد لاکھ سے متجاوز ہو جائیگی،

اخبار التراث العربی کے حالیہ شمارے کی ایک اطلاع کے مطابق چالیس ہزار سے زیادہ عربی مخطوطے صرف روس کے مختلف علاقوں میں ہیں، ان میں فارسی اور ترکی کے مخطوطات جو اسلامیات سے تعلق رکھتے ہیں، شامل نہیں، اقبالؒ نے یورپ کے کتاب خانوں میں جب اسلامی خزانے دیکھے تو ان کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں، اس وقت انھوں نے قطعہ لکھا، جس کے یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں : ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

واقعی اہل یورپ کی کتابوں کے محفوظ کرنے اور پھر ایک حد تک ان کے متعارف کرانے کی سعی مشکور ہوئی، البتہ مشرقی ممالک میں قلمی کتابیں نسبتًہ منتشر ہیں، اور ان سے استفادہ آسان نہیں، اکثر کتاب خانوں کی فہرستیں نہیں چھپی ہیں، ذاتی ذخائر کے بارے میں معلومات ہی نہیں، ضرورت ہے کہ ان ذخائر کا پتہ چلایا جائے، اور سب کتاب خانوں کی خواہ عمومی ہوں یا شخصی فہرستیں مرتب ہوں، اس کے بعد صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ذخائر کی کیا نوعیت ہے، اور ہمارے علوم کا کتنا سرمایہ مشرق میں موجود ہے، ادھر چند سالوں سے عرب ممالک میں کچھ علمی احساس بیدار ہوا ہے، اور اپنے علمی ورثہ کی بازیافت اور اس کے متعارف کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

اسلامی علوم سے متعلق جو قلمی ذخیرے ہیں، وہ اس لحاظ سے نہایت درجہ اہم ہیں کہ اتنے متنوع قسم کے مخطوطات کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملیں گے، اور تعداد کے اعتبار سے وہ ساری تہذیبوں پر فائق ہیں، صرف قرآن کریم کے مخطوطات پر غور کریں تو اسلامی تمدن کی علمی برتری پوری طرح واضح ہو جائیگی، اس صحیفے کے جتنے نسخے دنیا میں ہیں، کسی ایک کتاب کا کیا ذکر، متعدد فنی کتابوں کے سارے مخطوطات اتنے نہ ہوں گے، پھر ان پر جتنی فنکارانہ مشق ہوئی ہے اس کی مثال سارے عالم میں نہیں ملے گی، قرآن مجید کے نسخوں سے خطاطی کی تاریخ مرتب ہو سکے گی۔

اسلامی مخطوطات پر نظر ڈالنے سے ایک لحاظ سے اطمینان ہوتا ہے کہ باوجود اتنے کم ہونے کے دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں آج بھی وہ زیادہ وقیع ہیں، لیکن ساتھ ہی اتنے سرمایے کی بربادی پر بڑا افسوس ہوتا ہے، اور جیسا کہ عرض ہو چکا ہے برباد شدہ حصہ باقی حصے کا کئی گنا ہے، اگر محض عظیم مصنفین کے آثار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی تمام تصانیف ہم تک پہونچی ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی علوم سے متعلق ہمارا علم کتنا ناقص و نامکمل ہے، گم شدہ مواد کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں اس طرح قائم ہو سکتا ہے اگر ہم چند کتابوں کے مآخذ و منابع پر ایک نظر ڈال لیں، فی الحال میں تین کتابوں کا مطالعہ اس لحاظ سے پیش کرتا ہوں:

۱۔ فضائل بلخ، تالیف شیخ الاسلام صفی الدین ابوبکر عبداللہ بن عمر بن محمد بن داؤد واعظ بلخی، تالیف ۶۱۰ھ ۲۔ طبقات الصوفیہ خواجہ عبداللہ انصاری، تالیف ۴۸۱ھ۔ ۳۔ العباب الذاخر تالیف امام صغانی (م ۶۵۰ھ)

فضائل بلخ عربی زبان میں تھی، یہ کتاب مفقود ہے، اس کا فارسی ترجمہ باقی ہے، مترجم عبداللہ محمد بن محمد ابن حسینی بلخی اور ترجمہ کی تاریخ ۶۷۶ھ ہے، فضائل بلخ ستر ایسے مشائخ بلخ کا تذکرہ ہے جن سے حدیث تداول ہے، ان میں پہلے شیخ روماں بلخی ہیں جو صحابی تھے، فضائل بلخ کے مآخذ میں حسب ذیل کتابیں تھیں:

۱۔ مناقب بلخ، ناپید ہے۔ ابو زید بلخی، ۲۔ تاریخ بلخ محمد بن عقیل بلخی، ناپید ہے، ۳۔ کتاب البہجہ، ناپید ہے، ۴۔ طبقات عبداللہ جوئے باری، ناپید ہے، ۵۔ المعجم الکبیر ابو اسحاق مستملی، ۱۴ دفتر میں تھی، سمعانی نے کتاب الانساب میں تذکرہ کیا ہے، اب ناپید ہے۔ ۶۔ طبقات علی بن فضل، چار مجلد میں تھی، اب ناپید ہے، ۷۔ تواریخ بلخ ناپید ہے، ۸۔ تاریخ بلخ ناصر الدین سمرقندی، ناپید ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کا نام آیا ہے: ۱۔ سلوۃ العارفین، ناپید ہے، ۲۔ رسالہ قشیریہ، موجود ہے، ۳۔ تذکرۃ الاولیاء موجود ہے، ۴۔ الحدایق لاہل الحقایق، موجود ہے، ۵۔ کتاب ضحاک، ناپید ہے، ۶۔ نزہۃ الشیخ طہ ناپید ہے، ۷۔ کتاب النوازل، موجود ہے، ۸۔ کتاب النوادر، ۹۔ جمل الغرائب، موجود ہے، ۱۰۔ حلیۃ الاولیاء

موجود ہے، ۱۱. کتاب العافیہ، ناپید ہے، ۱۲. تصانیف ہرثمہ، ناپید ہے، ۱۳. امالی شیخ المشایخ، ناپید ہے، ۱۴. امالی شیخ الاسلام محمد بن احمد ملجی، ناپید ہے، ۱۵. امالی قاضی القضاۃ ابوبکر، ناپید ہے، ۱۶. کتاب الدلائل البینات، ناپید،

مؤلف کے آٹھ اہم منابع میں کوئی موجود نہیں، بقیہ سولہ کتابوں میں سے چھ موجود ہیں، اور ۱۰ مفقود۔

خواجہ عبداللہ انصاری کی طبقات الصوفیہ کے قبل کے متعدد صوفیہ کے تذکرے لکھے گئے تھے، ان میں سے سوائے سلمی (م: ۴۱۲) کے طبقات کے کوئی باقی نہیں ہے، خواجہ صاحب نے حسب ذیل ماخذ سے اپنا تذکرہ تیار کیا تھا:

۱. تاریخ مشائخ یا طبقات الصوفیہ، تالیف محمد بن علی حکیم ترمذی، ان کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی، ابوالحسن علی ہجویری صاحب کشف المحجوب نے یہ کتاب دیکھی تھی، یہ کتاب مفقود ہے۔

۲. اخبار الصوفیہ والزہاد، تالیف ابوبکر محمد بن داؤد بن سلیمان، متوفی ۳۴۲ھ سلمی کے استاد تھے، یہ کتاب بھی مفقود ہے۔

۳. طبقات النساک، تالیف ابوسعید احمد بن محمد عزنی، متوفی ۳۴۱ھ، ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اس سے استفادہ کیا ہے، اب ناپید ہے۔

۴. کتاب اسماء مشایخ فارس، تالیف ابوعبداللہ محمد بن خفیف، متوفی ۳۷۱ھ یا ۳۷۲ھ یہ کتاب اب موجود نہیں۔

۵. کتاب اللمع، تالیف محمد بن احمد بن ابراہیم معروف بہ ابوبکر مفید، ابونصر سراج نے اپنی تصنیف اللمع میں اس سے استفادہ کیا ہے،

۶. معجم الشیوخ، تالیف ابواسحاق ابراہیم بن احمد بن داؤد مستملی بلخی، متوفی ۳۷۶ھ، ابھی

مصنف کی ایک دوسری کتاب طبقات اہل بلخ بھی جو ابن حجر عسقلانی کے مطالعہ میں تھی، مجھے کسی نسخے کا علم نہیں۔

۷۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو العباس احمد بن محمد بن زکریا زاہد نسوی (۳۹۶ھ)

۸۔ تاریخ ابوبکر محمد بن عبد اللہ رازی شیخ خراسان استاد سلمی (۴۰۰ھ)

۹۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو عبد الرحمن محمد بن حسین سلمی (م ۴۱۲ھ)

یہی آخر الذکر کتاب باقی ہے، بقیہ کسی ایک کا پتہ نہیں۔

امام حسن بن محمد بن حسن صغانی لاہوری (م: ۶۵۰) مشارق الانوار کے لائق مصنف ہیں، ان کی کتاب العباب الزاخر لغت کی مشہور کتاب ہے، اس کے مقدمہ میں سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر ہے، ان میں سے نصف کے قریب فنا ہو چکی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

محمد بن حبیب بغدادی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب المنعم، موشح، موتف، المؤتلف والمختلف، کتاب ایام العرب، ابو حاتم سجستانی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب الطیر، کتاب النخل، ابن الصائب کلبی کی کتاب المعمرین، کتاب الازواق العرب، کتاب القاب الشعراء، ابن السکیت: کتاب الصغیر، کتاب البحث، کتاب الفرق، اخفش: کتاب النوادر، کسائی: کتاب النوادر وغیرہ وغیرہ۔

تفصیلات بالا سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اثاثے کا کتنا بڑا حصہ مفقود ہے، اس میں کلام نہیں کہ ان مفقود مخطوطات میں کچھ ایسے ضرور ہیں جو گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے ہیں، تحقیق و تلاش سے ان میں سے کچھ ضرور معلوم ہو سکتے ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ اب ایک نہضت شروع ہو چکی ہے، اس کے نتیجے میں کئی ہزار نئے مخطوطات سامنے آ گئے ہیں، خصوصاً عربوں میں اپنے ورثہ کی بازیافت اور ان کو عام کرنے کا شدید جذبہ

لہ یہ کتاب پروفیسر Johanes Pedersen دانش گاہ کوپن ہیگن کے اہتمام سے لیڈن سے دوبارہ ۱۹۶۰ء میں چھپی، پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں مصر سے تصحیح ہو کر طبع ہو چکی تھی۔

پیدا ہو چلا ہے، اس کے نتیجہ میں شام، عراق، لبنان، مصر، سعودی عرب، کویت، یمن وغیرہ ممالک میں تحقیقی ادارے کھلتے جا رہے ہیں، اور ان اداروں کے توسط سے نئے نئے مخطوطات سامنے آ رہے ہیں، ان کو متعارف کیا جا رہا ہے، کتاب خانوں کی فہرستیں شایع ہو رہی ہیں، اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو اسلامی علوم سے متعلق ہیں، ان سے رابطے قائم ہو رہے ہیں، ان ہی میں کویت کا ادارہ معھد المخطوطات العربیۃ ہے، اس سے ایک نہایت عمدہ علمی و تحقیقی مجلہ اخبار التراث العربی کے نام سے شایع ہو رہا ہے، اس میں نئے نئے مخطوطات اور نادر کتابوں کی اشاعت، کتاب خانوں کی فہرستوں کے بارے میں دلچسپ اطلاعات درج ہوتی ہیں، اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مجلہ کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے اس نہضت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا جو عالم عرب میں خصوصاً اور دنیائے اسلام میں عموماً شروع ہو چکی ہے یہ بڑی نیک فال ہے، اور اس سے واضح ہے کہ عالم اسلام کو اپنے ماضی کی شاندار علمی روایات کا احساس بخوبی ہو چکا ہے، اور امید کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ چند سالوں میں اسلام کی علمی روایت کی عظمت کا احساس عام ہو جائے گا، اور احساس زیاں سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ہو سکے گی، اس سلسلہ میں دو تین باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ دوسرے ممالک میں بھی اسی نوعیت سے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے، دوسرے یہ کہ ان تمام ممالک کے درمیان ایک علمی رابطہ قائم کرنا چاہیے، اس کے لیے ایک عالمی ادارے کے قیام کی ضرورت ہے، تیسری گذارش یہ ہے کہ دراصل عرب علوم اسلامی کو عربی ورثہ کہتے ہیں، یہ نام صحیح نہیں، اس کو اسلامی ورثہ کہنا چاہیے اس لیے کہ ان علوم کا تعلق نہ صرف عرب ممالک اور عربی زبان سے ہے، بلکہ غیر عرب ممالک خصوصاً ایران، ترکی، ہندوستان پاکستان وغیرہ مشرقی ممالک کا اسلامی علوم کی ترقی میں برابر کا حصہ ہے، اور اسی اعتبار سے عربی کے علاوہ فارسی ترکی، اردو کا مطالعہ اس سلسلہ میں ناگزیر ہے، بلکہ میں تو یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ملایا اور انڈونیشیا کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنا چاہیے، اس نہضت جہانی کی ابتدا ہو چکی ہے، اس میں ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کی ازبس ضرورت ہے۔

میری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی علوم نے تہذیب عالم کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے، لیکن اِن علوم کا بیشتر حصہ مدفون ہے، اور جو معلوم ہے، وہ گم شدہ حصے کا محض ایک قلیل جز ہے، اور اس آخر الذکر کا بڑا حصہ مخطوطات کی شکل میں جن کی کثرت کا عالم یہ ہے کہ بعض بعض ممالک میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جائے گی، مخطوطات میں بیشتر ایسے ہیں جہاں تک عوام کا کیا ذکر، فضلاء تک کی رسائی نہیں، ہمارا علم صرف مطبوعات تک محدود ہے، اور یہ مطبوعات کا حصۂ کثیر انتقاد متن کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا، اس سلسلہ میں حسب ذیل امور ازبس ضروری ہیں؛

۱. اسلامی مخطوطات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات بہم پہونچائی جائیں۔

۲. اہم مخطوطات کو چھاپ کر عام کیا جائے۔

۳. چھپی ہوئی کتابوں کو انتقاد متن کے اصول پر پھر سے چھاپا جائے۔

۴. گم شدہ مخطوطات کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ کی نہضت کا آغاز ہو چکا ہے، اور اہل عرب خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہیں، ان میں اپنے ورثہ کی بازیافت کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے مستقبل قریب میں اچھے نتائج کے سامنے آنے کی پوری توقع ہے ❂❂

بدہضمی ۔ برسات کی سوغات

بدہضمی کا علاج کارمینا سے کیجیے

برسات میں نظامِ ہضم خاص طور پر متاثر ہوتا ہے ،
اور بدہضمی کی شکایت عام ہوجاتی ہے ۔ ان دنوں میں معدے کی کارکردگی بحال رکھنے
کے لیے دونوں وقت پابندی سے کارمینا استعمال کیجیے ۔

کارمینا معدے کی گرانی اور ہاضمے کی تمام خرابیوں کا مؤثر اور مجرّب علاج ہے ۔

بدہضمی، قبض، گیس، سینے کی جلن اور تیزابیت
کی صورت میں کارمینا استعمال کیجیے ۔

کارمینا

نظامِ ہضم کو بیدار کرتی ہے ،
معدے اور آنتوں کے افعال کو
منظم اور درست کرتی ہے ۔

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

تحقیق، رُوحِ تخلیق ہے

Adarts-CAR-2/86

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ: شمس تبریز خان

آبنائے باسفورس کے ساحل پر
ملّت کی نشاۃ ثانیہ کی باتیں

(استنبول میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطاب)

حال ہی میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ "عالمی رابطۂ ادب اسلامی" کے اجلاس میں اس کے صدر کی حیثیت سے شرکت کے لئے جون کے آخری ہفتہ میں استنبول ترکی تشریف لے گئے تھے۔ جہاں ۱۷ شوال (۲۴ جون ۸۶ء) کو انہوں کو آبنائے باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ایک بلند مقام پر جہاں سے استنبول (قسطنطنیہ) کا عظیم تاریخی شہر نظر آتا تھا۔ ایک چیدہ مجمع کے سامنے تقریر کی جس میں ترک ادباء، اساتذہ، ایک سابق وزیر اور مشرق وسطیٰ کے مشہور عرب ادیب و مصنّف محمد قطب بھی موجود تھے۔ مولانا نے وہ دن ترکی کی عثمانی خلافت کے اسلامی آثار اور عظیم الشان مساجد کی زیارت اور ترکی کی مغربیت سے دوری کے مناظر دیکھنے کے سلسلے میں گذارا۔ ان متضاد تاثرات و مشاہدات نے ان کے دل و دماغ میں جو خیالات و تفکرات پیدا کئے پھر ان پر قرآن و ایمان نے جو جلا بخشی اسکے نتیجے میں یہ تقریر دلپذیر وجود میں آئی:

امابعد- برادرانِ محترم! میں راستے میں تھا کہ دفعتہً ایک آیتِ کریمہ میرے ذہن میں آئی- جس کے بارے میں میرا یہ خیال نہیں ہے کہ وہ بغیر ہدایت ربانی و اشارۂ غیبی کے میرے دل و دماغ میں طاری ہوئی-

یہ حقیقت ہے کہ کبھی کبھی دل و دماغ میں گذرنے والے افکار و خیالات اللہ کے بھیجے ہوئے مہمان اور القائے غیبی ہوتے ہیں- جن کا پورا لحاظ کیا جانا چاہئے- مجھے معلوم نہیں کہ یہ آیت کریمہ ایسے وقت میں کیسے میرے ذہن

ہیں آئی۔ جب کہ میں اسلام کے اس عظیم ملک میں ہوں جو کبھی عالم اسلام کا دھڑکنے اور پھڑکنے والا دل، اس کا سوچنے والا ذہن و دماغ اور اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا قال انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ ط قال کم لبثت ط قال لبثت یوما او بعض یوم ط قال بل لبثت مائۃ عام فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنہ ج وانظر الی حمارک ولنجعلک آیۃ للناس وانظر الی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما ط فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شیء قدیر ۔ (البقرہ ۲۵۹)

"کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے جیسے ایک شخص تھا کہ ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گذر ہوا، کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو اس کے مرنے کے بعد کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو سو برس تک مردہ رکھا پھر اس کو زندہ کر اٹھایا، پوچھا کہ تم کتنی مدت اس حالت میں رہے اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا۔ یا ایک دن سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ تو سو برس رہا ہے۔ تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ لے کہ نہیں سڑی گلی اور اپنے گدھے کی طرف نظر کر، اور تاکہ ہم تم کو ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں۔ اور ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں۔ پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو واضح ہو گئی کہہ اٹھا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں"

قرآن حکیم میں اپنے محدود و ناقص غور و فکر اور ناکافی تحقیق و مطالعہ کی روشنی اور تلاوت قرآن کرنے والے ہر مسلمان کو قرآن فہمی کی جو توفیق ملتی ہے اس کے پیش نظر میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اپنے اندر اس سے کہیں زیادہ گہری معنویت، وسیع مفاہیم و مطالب اور دور رس امکانات و مضمرات رکھتی ہیں جتنی کہ مفسرین کرام اپنے اپنے زمانوں میں ان کو پیش کر سکے ہیں اور جتنا کہ اہل علم نے اپنے حالات اور تحقیقات کی روشنی میں سمجھا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہاں صرف جسمانی و مادی زندگی کی واپسی ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا بلکہ اس میں معنوی و روحانی زندگی باطنی نشاۃ ثانیہ اور اس تاریخی کردار کی واپسی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جیسے کسی امت و معاشرہ یا قوم و ملک نے انجام دیا ہے۔ اور اس پیغام کی تازہ کاری اور حیات آفرینی کی طرف بھی لطیف اشارہ ہے۔ جس کی یہ امت حامل تھی۔ اسی طرح اس میں اس پختہ ایمان و عقیدہ کے احیاء کا امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ جو کبھی اس امت کی رگ و پے میں گرم لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ اور جو پھر سرد پڑ گیا۔ اور اس فتح و ظفر کی بازگشت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے جو کبھی اس مسلمان ملک و قوم کو حاصل تھی۔

میں سمجھتا ہوں یہ آیت کریمہ ان سب پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک کی قسمت پر مہر لگ چکی ہے اور اس کے لئے خدانخواستہ یہ دائمی فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ غیر اسلامی زندگی گذارتا رہے گا اور ہمیشہ جاہلیت کی زندگی گذارتا رہے گا۔ اور ہمیشہ جاہلیت کی پستی میں پڑا رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اشارہ و لطیفہ غیبی کے طور پر فرماتے ہیں کہ:۔

" اپنے کھانے پینے کے سامان کو دیکھو کہ وہ خراب نہیں ہوا "

اور جب ایک زمانہ گذرنے کے باوجود کھانا اور پانی خراب نہیں ہو سکتے تو وہ آسمانی و ربانی، ابدی و آفاقی پیغامات کس طرح خراب اور از کار رفتہ ہو سکتے ہیں جن پر حیات انسانی کا دارومدار، انسانیت کا انحصار ہے اور جن سے اس کا وقار اور اغلبانہ قائم ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

" وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ان اللہ بالناس لرؤف رحیم ۰ (بقرہ ۱۴۳)

" اور اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کر دیں واقعی اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بہت ہی شفیق مہربان ہیں "

۱۹۷۶ء میں ترکی میں اپنی پہلی حاضری کے موقع پر میں نے بعض ترک نوجوانوں سے یہ کہا تھا:

" یہ قوم جس کو اللہ تعالیٰ نے آخری تعمیر حرم کی توفیق عطا کی (چنانچہ خانہ کعبہ کی موجودہ عمارت سلطان مراد عثمانی کی ہے) اور وہ قوم جس کو مسجد نبوی کی تجدید و توسیع کا شرف حاصل ہوا (کہ مسجد شریف کی موجودہ تعمیر سلطان عبدالمجید ثانی کے ذریعہ ہوئی) تو اللہ تعالیٰ اس قوم کے دین و ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ اور اس اولوالعزم قوم کو سعادت و قیادت سے محروم نہ فرمائے گا۔ یہ آیت شریفہ ہمارے دلوں میں امید و آرزو کو زندہ کرتی اور ہمارا اعتماد بحال کرتی اور ہمارے سرد جذبات ناکام امیدوں اور تمناؤں کو از سر نو بیدار کرتی اور قیاس آرائیوں اور بدشگونیوں کو دور کرتی ہے کیونکہ جب اللہ کی قدرت سے خورد و نوش کا سامان عرصۂ دراز تک خراب نہیں ہو سکتا اور یہ عمارات و محلات شاہی گردش لیل و نہار کے برخلاف عرصے تک قائم رہ سکتے ہیں۔ تو یہ قوم اسلام کے ساتھ کیوں نہیں قائم رہ سکتی ہے جو ان تعمیرات و محلات اور ان تمدنی مظاہر و مآثر کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور و بااثر، انسانیت کے لئے نافع و مفید اور صالح و صحیح انسانی زندگی کے لئے ضروری و ناگزیر ہے۔

حضرات میں آپ کے لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ اپنے محدود تجربات و تاثرات یا کسی محدود دائرے کے مطابق ان آیات کی تشریح کروں، اس موقع پر میرا اشارہ پورے عالم کی طرف ہے۔ کیونکہ عالم اسلامی بھی پہلے اجزائے پریشاں کی طرح تھا جس کی اسلام نے شیرازہ بندی کی۔ اور اسے ایک رشتۂ وحدت میں پرو دیا۔ اس پر تاریک دور بھی گذرے اور پھر تاریکی کے بادل چھٹتے بھی رہے۔ میں تو یادش بخیر اپنے فردوس گمشدہ اسپین (اندلس) سے بھی

مایوس نہیں کہ جہاں بحمداللہ دلوں میں اسلام سے محرومی کے ناقابل تلافی نقصانات کا احساس بیدار ہو رہا ہے، مجھے امید ہے کہ ایک دن اسپین پھر اسلام کے سایہ رحمت تلے آجائے گا، انشاء اللہ۔ اور وہاں اسلامی بیداری کی لہر پیدا ہوگی۔ ہسپانوی لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اسلام سے کٹ جانے کے بعد وہ بین الاقوامی برادری میں بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں۔ جب کہ کبھی اسلامی اندلس کو دینی و علمی، ادبی و شعری، فکری و روحانی، قیادت و مرکزیت حاصل تھی جس کا تاریخوں میں ذکر ہوتا ہے اور وہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جب سے اس نے اسلام سے اپنا رشتہ توڑا تو وہ یورپی اقوام کی لمبی فہرست میں نویں، دسویں نمبر پر آگیا۔ اور اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اب نہ وہاں کوئی جدت و عبقریت نظر آتی ہے۔ نہ اس کی کوئی انفرادی آواز اور کوئی مخصوص پیغام سنائی دیتا ہے۔ اب وہ متعدد یورپی ممالک کا ایک ایسا ملک بن کر رہ گیا ہے جہاں سیاح صرف اسلامی و عربی نقوش و آثار (مسجد قرطبہ و قلعۃ الحمراء وغیرہ) دیکھنے جاتے ہیں اس لئے میرا یقین ہے کہ عالم اسلامی کا ہر وہ ملک جس کو دشمنوں نے مسلمانوں کی قیادت اور فعال کردار ادا کرنے اور اپنی انفرادیت اور صلاحیت ظاہر کرنے سے محروم کر دیا ہے کبھی نہ کبھی اس کے دن پھریں گے۔ اور وہاں اسلامی تاریخ اپنے کو پھر دہرائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ یہ آیت شریفہ میرے ذہن میں اسی طرح کے بلند مفاہیم و معانی سمجھانے کے لئے آئی اور اس نے یہ بتایا کہ یہ موت و حیات جن کا چکر انسانی زندگی اور بشری تاریخ میں چلتا رہتا ہے وہ کسی فرد و جماعت کے لئے ابدی و دائمی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ان کی حیثیت عارضی و عبوری ہوتی ہے۔ اور وہ زندگی کے بدلتے رہنے والے مرحلوں میں سے ایک مرحلہ ہوتی ہیں۔ اس لئے جب کبھی غنودگی یا وقتی موت طاری ہوگی تو اللہ کی عنایت سے اس کے بعد بیداری اور زندگی بھی پیدا ہوگی۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ جو مسلم اقوام و ممالک اس وقت نازک اور بحرانی دور سے گذر رہے ہیں وہ دراصل ایک وقتی و عبوری زمانے سے گذر رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ وہ مستقبل قریب میں اسلام کے سائے تلے ہوں گے۔ خصوصاً عالم اسلامی کا یہ ملک، اسلام کا جو علم و فہم اور اسلام سے جو شیفتگی و فریفتگی اور اس کے لئے فداکاری و جاں نثاری کا جو ناقابل تسخیر جذبہ رکھتا تھا اور انسانی قیادت کے جس مقام بلند پر تھا اس پر انشاء اللہ پہنچ کر رہے گا۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز والحمد للہ رب العالمین

پروفیسر حافظ سید خالد محمود ترمذی

تخلیق پاکستان کے مقاصد اور شریعت بل

مجھے بہت حیرانی ہوتی ہے کہ بعض لوگ اپنے فن اور پیشے کو اس قدر مقدس بنا لیتے ہیں کہ اس سے متعلق افراد کے کردار کو نہ اسمبلی میں زیر بحث لایا جا سکتا ہے نہ اخبارات میں لیکن یہی لوگ سیاست تو چھوڑیئے اپنے مذہب (جو تمام دنیا کے نزدیک حقیقتاً مقدس ہے) کے معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑانے کو اپنا حق سمجھتے ہیں خواہ ان کو اس کا حق کہیں سے ملا ہو یا نہ ملا ہو۔ وہ از خود اپنا استحقاق پیدا کر لیتے ہیں۔

میجر ریٹائرڈ منظور حسین خان کا ۱۹ اور ۲۰ جولائی کے جنگ میں شائع شدہ مضمون "تخلیق پاکستان کے مقاصد اور شریعت بل" اسی ذہنیت کا غماز ہے۔ وہ سینیٹر مولانا سمیع الحق جیسے عظیم سکالر اور عالم فاضل کو (جو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور جیسے بلند پایہ عالم کے لخت جگر ہیں ان کے پروردہ اور تربیت یافتہ ہیں جو خود قومی اسمبلی کے معزز رکن ہیں اور بار ہا رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے ہیں) مذہب پر لکھنے اور سینیٹ میں شریعت بل پیش کرنے کا حق نہیں دیتے۔ لیکن خود بغیر کسی استحقاق کے مذہب پر لکھنا وہ اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں۔ اگر وہ دفاع پاکستان پر کوئی مضمون سپرد قلم کرتے تو ہم ان کی بات مان لیتے لیکن آج کے ـــــ Specialisation کے دور میں ان کا مذہب پر بغیر کسی سند کے خامہ فرسائی کرنا باعث حیرت ہے۔

آپ فرماتے ہیں "تخلیق پاکستان" "دو قومی نظریہ" کی مرہون منت ہے۔ اور اس نئی مملکت کو "مسلم قومیت" کی بنا پر حاصل کیا گیا ..... قائد اعظم نے قوم کی تعریف مروجہ اصول سیاسیات کے تحت کی جس کی بنا پر عصر حاضر میں قومی ریاستیں وجود میں آئی ہیں انہوں نے اس غرض کے لئے "کسی مذہبی نظریہ کا سہارا لیا نہ اپنی تحریک کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی"

اس ایک جملے میں موصوف کئی متضاد باتیں کر گئے ہیں۔ کہ بانی پاکستان نے اس نئی مملکت کو "مسلم قومیت" کی بنا پر حاصل کیا۔ پھر اگلے ہی سانس میں آپ فرماتے ہیں کہ قائد اعظم نے قوم کی تعریف مروجہ اصول سیاسیات کے تحت کی جس کی بنا پر عصر حاضر میں "قومی ریاستیں" وجود میں آئی ہیں۔

مروجہ اصول سیاسیات کے تحت قوم، قومیت مسلم قومیت اور قومی ریاست کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔ انگریزی لفظ نیشن (NATION) یعنی قوم لاطینی لفظ Natus سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں (BORN) یعنی پیدائش یا نسل وغیرہ۔ یہ لفظ لوگوں کی صرف اس جماعت کے لئے استعمال ہوتا ہے جو ایک ہی نسل سے ہوں اور جن کے درمیان برادرانہ تعلقات ہوں۔ قوم اور قومیت کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ دو مختلف تراکیب ہیں۔ علامہ ابن خلدون قوم کو ایک گروہ یا قبیلے کا نام دیتے ہیں مگر قومیت ان کے نزدیک جذبے کا نام ہے۔ جسے وہ "عصبیت" کہتے ہیں۔ یہ لفظ "عصبہ" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پٹھے۔ انسانی جسم میں تمام پٹھے باہم اس طرح مربوط ہوتے ہیں اور ان میں اس طرح اشتراک احساس پایا جاتا ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے میں کوئی تکلیف ہو یا جسم کا کوئی حصہ کسی چیز سے مس کرے تو فوراً ہی تمام جسم کو اس کا احساس ہو جاتا ہے اسی طرح قومیت روح یا جذبہ ہے۔ جو تمام قوم میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ قوم کے ایک فرد کا احساس تمام قوم کے احساس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ قوم کی تکمیل یا اس کی اعلیٰ ترین حیثیت و مرتبے کے لئے قومیت کے جذبے کا بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہے۔" (مقدمہ ابن خلدون)

لارڈ برائس نے قوم کی تعریف یوں کی ہے:۔

قوم ایک ایسے افراد کا گروہ ہے جو عام طور پر کسی خاص علاقے پر قابض ہوں ان کی اپنی سیاسی تنظیم ہو وہ یا تو آزاد ہوں یا آزادی کے لئے جدوجہد میں مصروف ہوں۔ اور چند خصوصیات مثلاً نسل، مذہب، زبان، رسم و رواج، تاریخ اور مستقبل کے منصوبے کی بنیاد پر آپس میں متحد ہوں۔

گلکرائسٹ قوم کو ریاست اور قومیت کا مجموعہ کہتا ہے یعنی ریاست + قومیت = قوم قومیت کی تشکیل کرنے والے عوامل سات ہیں۔ اشتراک نسل، اشتراک مالش یعنی وطن، اشتراک زبان و لٹریچر، تاریخ روایات اور تمدن کا اشتراک، اشتراک مفاد۔ سیاسی اجتماع اور احساس آزادی کا اشتراک، اشتراک مذہب۔

علامہ اقبال نے مسلم قومیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"مسلمانوں اور دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن، نہ اشتراک اغراض اقتصادی بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لئے شریک ہیں کہ بظاہر کائنات کے متعلق ہمارے سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔"

قوم اور قومیت کے موجودہ تصور کی بنیاد جدید نیشنلزم ہے جو کوئی زیادہ پرانا نہیں۔ یورپ میں جب عیسائیت کو چھوڑ کر اس کی بجائے مادہ پرستی کو مذہب قرار دیا گیا تو نیشنلزم کی بنیاد وطنیت قرار پا یا جس کے

تحت اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہر جائز و ناجائز فعل ٹھیک اور سچا ٹھہرا۔

اسی اصول سیاسیات کا سہارا لے کر (کہ قوم وطن سے بنتی ہے) تو نہرو نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ برصغیر میں دو قومیں بستی ہیں ایک ہندو اور ایک انگریز۔ لیکن بانیٔ پاکستان نے اس مروجہ اصول قومیت کو تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے اسلامی نظریہ قومیت کا سہارا لے کر جس کے تحت کسی قوم کی بنیاد اشتراک مذہب پر قائم ہوتی ہے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں ایک تیسری قوم بھی ہے جس کا نام مسلمان ہے اسی لئے آپ نے مسلم قومیت کی بنیاد ہندو اور مسلمانوں کے باہم گر متصادم نظریات اور مختلف تہذیبوں کو قرار دیا (جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اسے تسلیم کیا ہے)

میں فاضل مضمون نگار سے پوچھتا ہوں کہ آخر ہندو اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے کیسے ہو گیا۔ جب کہ دونوں ایک ہی ملک میں عرصہ دراز سے آباد تھیں اور اب بھی مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد ہندوستان میں آباد ہے۔ اور ہندو پاکستان میں آباد ہیں۔ یعنی اشتراک وطن کا عامل دونوں قوموں میں مشترک ہے۔ اس کے علاوہ اشتراک نسل، اشتراک مفاد نیز سیاسی اجتماع اور احساس آزادی کا اشتراک اور اشتراک مذہب کے عوامل مشترک نہیں تھے۔ اس لئے ان کا تعلق مختلف تہذیبوں سے قرار پایا کیوں کہ ان کی تہذیبوں کی بنیاد کیا ہے۔ جواب یہی ہے کہ ان کی بنیاد بھی مذہب ہی ہے۔ ان کی تہذیب کی بنیاد بت پرستی پر ہے جو ان کا مذہب ہے۔ ہماری تہذیب کی بنیاد بت شکنی پر ہے۔ کہ ہمارا یہی مذہب ہے ان کی زندگی کے متعلق نظریات کی بنیاد آواگون یعنی تناسخ کے عقیدے پر ہے کیونکہ یہ ہندومت کا بنیادی عقیدہ ہے جب کہ ہماری زندگی کے متعلق نظریات آخرت اور زندگی مابعد الموت کے عقیدے پر قائم ہیں۔ اور یہ عقیدہ ہمیں ظاہر ہے اسلام نے سکھایا ہے۔

یعنی ثابت یہ ہوا کہ مسلم قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے جیسا کہ علامہ اقبالؒ کی اوپر دی گئی مسلم قومیت کی تعریف سے بھی ظاہر ہے اور انہوں نے محض اشتراک وطن کے عامل کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا:-

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یعنی موصوف کا یہ کہنا غلط ہوا کہ بانیٔ پاکستان نے قوم کی تعریف مروجہ اصول سیاسیات کے تحت کی۔ البتہ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے مسلم قومیت کا سہارا لیا جس کی بنیاد مذہبی نظریہ ہے لہذا آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہوا کہ بانیٔ پاکستان نے اس غرض کے لئے کسی مذہبی نظریہ کا سہارا نہ لیا۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کو مذہبی رنگ نہیں دیا یہ بھی غلط ہے کیونکہ آپ خود لکھتے ہیں کہ:-

"بانی پاکستان نے صاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ نئی مملکت ایک جدید جمہوری ریاست ہوگی جسے اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔ لیکن اسے ہرگز تھیاکریسی یعنی مذہبی ریاست میں تبدیل نہیں ہونے دیا جائے گا"

موصوف پر یہ واضح ہونا چاہیے کہ اسلامی ریاست اور ایک مذہبی ریاست میں جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کی طرز پر حکومت کرتے ہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لئے اسلامی ریاست کا نمونہ خلفاء راشدین کی خلافت راشدہ ہے۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ ان چاروں خلفاء میں سے کس نے اپنے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ سب مسلمانوں کے منتخب خلفاء تھے۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز بن مروان جنہیں پانچواں خلیفہ راشد تسلیم کیا جاتا ہے کو اگرچہ سلیمان بن عبدالملک نے نامزد کیا تھا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو عوام الناس جنہیں شاہ ولی اللہ نے "خلافت باطنیہ" قرار دیا ہے کے سامنے پیش کیا آپ نے فرمایا "میں تم پر امیر بنا دیا گیا ہوں تم میری اطاعت سے آزاد ہو تم کسی کو بھی جسے تم چاہو امیر چن سکتے ہو"

لوگوں نے کہا آپ کو ہی امیر چن لیا۔

بہرحال اسلامی ریاست کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں حاکمیت اعلیٰ یعنی ساورنٹی اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے یعنی اس کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہے۔ کیا موصوف اس تاریخی حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں کہ تحریک پاکستان جب زوروں پر تھی تو اس کا نعرہ کیا تھا؟ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ یعنی پاکستان کا قیام اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے تھا۔ لہذا آپ کی یہ بات بھی غلط ٹھہری کہ بانی پاکستان نے تحریک پاکستان کو مذہبی رنگ نہیں دیا۔ ورنہ آپ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو یہ نہ فرماتے کہ میں عوام کا محاذ سنبھالتا ہوں آپ علماء کا محاذ سنبھالیں یعنی آپ علماء کو قیام پاکستان کے لئے قائل کریں۔

نیز موصوف دنیا میں موجود کسی ایسی جدید جمہوری ریاست کی نشان دہی کریں گے کہ جو مذہبی اصولوں کے مطابق چلائی جا رہی ہو۔ دنیا کی تمام جمہوری ریاستیں سیکولر نہیں لادینیت کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہیں یہاں تک کہ اسلامی ممالک میں بھی جہاں نظر بظاہر نام نہاد قسم کی جمہوریت ہے وہ بھی اسلامی اصولوں پر نہیں چلائی جا رہی۔ مذہب وہاں ایک ذاتی معاملہ ہے۔ پاکستان میں کونسا نظام حکومت ہے۔ یہ تو دنیا کا کوئی ماہر سیاسیات بھی نہیں بتا سکتا۔ ہم سے تو ہمارا ہمسایہ ہی اچھا ہے۔ وہاں سیکولر جمہوریت تو قائم ہے بلکہ وہاں تو ایک نئی قسم کی جمہوریت قائم ہوتی ہے جسے میں موروثی جمہوریت کا نام دوں گا کہ باپ کے بعد بیٹی اور بیٹی کے بعد پوتا بھئی واہ کیا خوب جمہوریت ہے! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہندوستان پر اسی برہمن

خاندان کا ہی قبضہ رہے گا۔ یعنی یہ جمہوری بادشاہت ہے۔ "شاہی جمہوریت" بھی کہہ سکتے ہیں بس تاج شاہی کا فرق ہے۔

ہمارے ہاں بھی ایک جماعت اسی طرز کا نظام حکومت یعنی موروثی جمہوریت قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ کیونکہ یہاں نہ پارلیمانی نظام حکومت ہے نہ صدارتی۔ نہ جمہوریت ہے نہ اسلامی نظام حکومت ہے۔ کچھ عرصہ قبل ۱۲ ربیع الاول کو بڑی دھوم دھام سے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ آج سے ملک میں اسلامی شریعت نافذ ہوگئی۔ اب حکومت کی طرف سے اسلامی ذہن رکھنے والے علماء ارکان پارلیمنٹ کے شدید دباؤ کے پیش نظر نیوال شریعت بل پیش کیا گیا بلکہ پاس کیا گیا ہے خدا کرے کہ عملاً شریعت بل کا مقدمۃ الجیش ثابت ہو۔

پھر آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں "کتنی ستم ظریفی ہے کہ جن علماء دین نے تحریک پاکستان کی نہ صرف شدید مخالفت کی بلکہ برملا یہ دعویٰ بھی کیا کہ اس تحریک کے قائدین اس نئی مملکت کو ایک لادینی ریاست کے طور پر چلائیں گے۔ وہ الٹا یہ سمجھانے نکل پڑے کہ وطن عزیز کے قیام کا مقصد فقط الٰہی شریعت کا نفاذ تھا جس میں گذشتہ کئی صدیوں سے اجتہاد ہی نہیں کیا گیا اور جسے وہ ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں"

موصوف کی اس عبارت سے بھی صاف عیاں ہے کہ تحریک پاکستان کے قائدین نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مذہبی نہیں تو اسلامی ریاست قائم کریں گے یا نئی مملکت میں اسلامی نظام قائم کریں گے۔ ورنہ علماء دین کو (بقول خود موصوف کے) اس دعویٰ کے جھٹلانے کی ضرورت نہیں تھی یعنی علماء دین کو یہ برملا دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ تحریک کے قائدین پاکستان کو ایک لادینی ریاست کے طور پر چلائیں گے۔ بلکہ پھر تو وہ سیدھا سیدھا براہ راست یہ الزام لگاتے دیکھا کہ تحریک کے قائدین پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔

نیز کیا آج تک کسی حکومت نے ان کے اس برملا دعویٰ کو غلط کرکے دکھایا اگر یہاں اسلامی نظام حکومت قائم کر دیا جاتا تو علماء دین کا یہ برملا دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا۔ لیکن ان کا دعویٰ تو آج بھی صحیح ہے برحق ہے۔ بلکہ آپ نے تو اس شریعت کے نفاذ کو ہی متنازعہ بنا دیا ہے۔ کہ آیا یہ ملک اس لئے قائم کیا گیا کہ یہاں شریعت نافذ ہو یا اس لئے کہ یہاں اسلامی اصولوں کے مطابق جمہوریت۔

پھر آپ نے اجتہاد جیسا نازک مسئلہ چھیڑ دیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج پاکستان میں یا عالم اسلام میں اس پایہ کا عالم دین ہے جو شریعت میں اجتہاد مطلق کر سکے؟ جب اچھے اچھے ثقہ علماء جنہیں ہم سمجھتے ہیں کہ وہ مجتہد کے پایہ کے عالم ہیں خود کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ شریعت میں اجتہاد کریں تو کیا ہم اور آپ اجتہاد کریں گے؟

فرماتے ہیں "آج بھی اجتہاد کا دروازہ کھولا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ واقعاتی دنیا میں صدیاں ہوئیں وہ کنجی گم ہو چکی ہے" تو کیا ہم اور آپ اجتہاد کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔ کیا ہمارے یا آپ کے پاس وہ کنجی ہے جس

سے ہم یا آپ اجتہاد مطلق کا دروازہ کھول سکیں ؟ مجتہد کے لئے بھی فقہ اسلامی میں کچھ شرائط ہیں۔ جن کی عدم موجود گی میں کوئی عالم دین اجتہاد نہیں کرسکتا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لئے پوری ایک کتاب درکار ہے۔

پھر موصوف فرماتے ہیں کہ شریعت کو علماء دین ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں۔ سبحان اللہ! یعنی گویا انہوں نے اپنی طرف سے شریعت کو اٹل اور ناقابل تغیر و تبدل سمجھ لیا ہے۔ یعنی یہ بھی ان کا اپنا گھڑا ہوا دعویٰ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لَا تَبْدِیلَ لِکَلِمَاتِ اللہِ ۔ ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللہِ تَبْدِیلًا ۔ تو ہرگز (تاکید ہے) اس کے طریقے میں تبدیلی نہیں پائے گا۔ یعنی اس کا طریقہ (اس کا قانون) اٹل ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ۔ ترجمہ۔ آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری (تمام) کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام بطور دین پسند کیا ہے (سورۃ المائدہ)

جب ایک چیز مکمل ہو جاتی ہے تو کیا اس میں کسی تغیر و تبدل، حک و اضافے ترمیم و تنسیخ کی حاجت رہ جاتی ہے جب شریعت الٰہی مکمل ہو گئی اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی حک و اضافے یا رد و بدل کی ضرورت نہیں رہی تو وہ اٹل اور ناقابل تغیر و تبدل ہی ٹھہرے گی۔ یعنی یہ تو آپ الٰہی دعوے کی تکذیب کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ نے یہ کہہ کر کہ ،، ہر شریعت الٰہی اور لادینی ریاستوں کے قوانین کے اصل ماخذ قدیم روایات اور قوموں میں رائج رسم و رواج ہی ہوا کرتے ہیں۔

شریعت الٰہی اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی فرق کوئی امتیاز باقی نہیں چھوڑا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ اس کے بندے خالق کو مخلوق کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ عبارت پڑھ کر تو آپ کی عقل پہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ آخر پھر انبیا و رسل کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب انسان اپنا اچھا بھلا خود سوچ سکتا ہے انسان اپنے ذاتی مفاد سے بالا ہو کر قانون سازی کر سکتے ہیں۔ تو پھر وحی الٰہی کی کیا حاجت تھی ؟ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟ آخر آپ کیا باور کرانا چاہتے ہیں ؟ آپ قائد اعظم کے ارشادات کو تو اٹل اور ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے ہیں کہ وہ اگر بقول آپ کے پاکستان کو ایک قومی ریاست کی شکل دینا چاہتے تھے لیکن آج پاکستان کے عوام اسے اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں یہاں اسلامی نظام نافذ کرنا ان کی دیرینہ آرزو ہے۔ تو آپ ان کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ حسب منشا بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور رضا کے مطابق یہاں شریعت الٰہی کا نفاذ کریں کیونکہ بقول آپ کے یہ بانی پاکستان کی مرضی نہیں تھی۔ آپ کی نظر میں یہ روش بابائے قوم کی شان میں گستاخی کے مترادف ہے لیکن کیا آپ کا شریعت الٰہی کو قدیم روایات اور رسم و رواج

پر مبنی، اور لادینی ریاستوں کے قوانین کے برابر ٹھہرانا اور اس کا ماخذ وحی الٰہی کو نہ ماننا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی نہیں تو کیا ہے ؟ جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِن ھُوَ اِلّا وَحیٌ یُّوحیٰ ۔ ترجمہ۔ مگر رسول وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ یعنی یہ قرآن وحی الٰہی ہے۔ اگر آپ شریعت الٰہی کا ماخذ وحی الٰہی یعنی قرآن نہیں مانتے تو پھر تمام کا تمام بکری کو کھلا دیں اس کے باقی رکھنے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ اسی حصے میں تو چور کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) لکھی ہے۔ جو قریش میں عام تھی قریش میں تو اپنے باپ کی بیوہ یعنی ماں سے نکاح بھی رائج تھا۔ کیا قرآن نے اسے جائز قرار دیا۔

آپ لکھتے ہیں چودہ سو برس قبل اور اس سے بھی قدیم زمانوں میں اکثر و بیشتر قبائلی نظاموں میں قوموں کے اعراف و عادات کو ہی قانون کا درجہ حاصل رہا۔ اور اسی بنا پر آسمانی دستور اور ملکی قوانین بنتے اور بدلتے رہے اس امر کی وضاحت امام الہند شاہ ولی اللہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

" انبیاء علیہم السلام کے سامنے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں جن ارتفقات یعنی معاشرتی انتظامات اور تدابیر کا رواج ہے ان میں ضروری اصلاح کریں اس لئے وہ ان کو یکسر چھوڑ کر ایسی باتوں کی دعوت نہیں دیتے جو ان کی قوم کے لئے بالکل اجنبی و غیر مالوف ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو شاذ و نادر۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ مصالح کے محل و موقع زمانوں اور عادات کے اختلاف کے ساتھ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لئے شریعتوں میں نسخ کا واقع ہونا صحیح ہے "

لیکن اس تمام عبارت سے یہ نتیجہ کہاں اخذ ہوتا ہے کہ شریعت الٰہی یا آسمانی دستور ملکی قوانین یا رسم و رواج پر مبنی ہوتے تھے۔ شاہ صاحب فرما رہے ہیں کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں جن تدابیر کا رواج ہے ان میں ضروری اصلاح کریں اس کا تعلق تدبیر منزل سے ہے۔ قریش میں یہ رواج تھا کہ جب کعبے کا طواف کر کے گھروں کو لوٹتے تو دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ گھر کے عقب میں نقب لگا کر یا دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتے تھے۔ انہیں کہا گیا کہ گھروں میں دروازوں سے ہی داخل ہوا کرو۔ دروازے لگائے ہی اس لئے جاتے ہیں۔ یہ بد تہذیبی ہے کہ دیواریں پھاندی جائیں۔ پھر وہ دوسروں کے گھروں میں حتیٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی بلا اذن در آیا کرتے۔ اس سے منع فرمایا گیا کہ اہل خانہ سے اجازت لے کر اس کے گھر میں قدم رکھو۔ اور اہل خانہ کو سلام دیا کرو۔ اگر صاحب خانہ کسی مصروفیت کی وجہ سے آپ سے اس وقت نہ ملنا چاہے اور ذرا ٹھہر کر دوبارہ آنے کو کہے تو اسے محسوس نہ کیا جائے۔ بلکہ اسی میں بہتری ہے کہ آپ لوٹ آئیں اور پھر کسی فارغ وقت میں اس سے ملیں۔ تو اس طرح کی ان کی معاشرت میں بہت سے غلط باتیں رواج پا گئی تھیں جن کی اصلاح کی گئی۔ بول چال میں، چال ڈھال میں، کھانے پینے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، سونے

جا گئنے ہیں الغرض معاشرت کے سلسلے میں بہت سے آداب اسلام نے ان کو سکھائے۔ اور ان کی معاشرتی انتظامات میں اصلاح کی۔ مثلاً اللہ کی زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ بولو تو چلا کر نہیں گدھے کی طرح۔ حلال و طیب چیزیں کھاؤ۔ سود اور شراب کو حرام قرار دیا حالانکہ یہ سب رواج قریش میں رائج تھے۔ ان کو یکسر بدل دیا گیا۔

پھر شاہ صاحب نے شریعتوں میں نسخ کے وقوع کو صحیح کہا ہے۔ اس لئے کہ انبیاء کا سلسلہ جاری تھا ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کے مصداق یہ ضروری بھی تھا نیز اس لئے کہ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل شریعت عیسوی موجود تھی لیکن کس صورت میں کہ خود حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور خدا قرار دے دیا حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام نے ایسی کوئی تعلیم نہیں دی۔ آج تک عیسائی حضرت عیسیٰ بلکہ آپ کی والدہ حضرت مریم کو خدائی میں شریک سمجھتے ہیں تثلیث کا عقیدہ کیا حضرت عیسیٰؑ نے سکھایا تھا۔ لہذا ایک نبی کی ضرورت تھی۔ جو اس شرک کا قلع قمع کرے۔ سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے لیکن کس شان سے آئے نبی آخر الزمان ہو کر جلوہ فرما ہوئے خود خدا نے جن کے متعلق فرمایا۔

ما کان محمداً ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین ۰

ترجمہ۔ نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی شخص کے باپ لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں۔

پھر آپ کی زبانی ارشاد ہوا: یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ۰

ترجمہ۔ اے بنی نوع انسان! میں تم سب کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آپ کی حدیث مبارک ہے۔ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی

پھر اس شریعت میں نسخ کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد سلسلۂ نبوت منقطع ہو گیا۔ آپ کی لائی ہوئی شریعت مکمل و کامل و اکمل ہو گئی۔ پھر اس میں تبدیلی کی اول تو ضرورت ہی نہیں اگر بالفرض ضرورت ہے بھی تو اس کی تبدیلی کا مجاز تو نبی ہی ہوتا ہے۔ وہ آتا نہیں ہے تو پھر میں اور آپ تو تبدیلی کے مجاز نہیں ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہیں تو آپ کر سکتے ہیں آپ کو کون روکتا ہے۔ اس ملک میں ایک لڑکی رسول کی شان میں گستاخی کر سکتی ہے۔ ایک شخص اسلام اور زعمائے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کر سکتا ہے ان کی کوئی زبان بندی نہیں کرتا بلکہ الٹا ان کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ان کو استعفیٰ لے دئے جاتے ہیں تو آپ بقول شاعر

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

قرآن کو بدل دیں گے تو آپ کا کوئی کیا بگاڑ لے گا۔ شاید آپ کی بھی واہ واہ ہو جائے۔ آپ بھی پبلک

لیڈر بن جائیں۔ آپ کو بھی حق بجانب ثابت کرنے کیلئے لوگ بیانات دیں گے۔ اور مضامین لکھیں گے۔

غالباً آپ نے شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر نہیں پڑھی۔ جس میں انہوں نے قرآن میں ناسخ منسوخ آیات کی تعداد کافی کم کر دی ہے۔ یعنی آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن میں معدودے چند آیات منسوخ ہیں۔ آیت ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا کی رو سے اللہ تعالیٰ کو ہی قرآن میں رد و بدل کا حق ہے۔ انہوں نے ان آیات کا بھی ذکر کیا ہے جو منسوخ ہیں۔ اور ان آیات کا بھی جنہوں نے انہیں منسوخ کیا ہے۔ بہرحال ماچشما کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ قرآن میں اور شریعت میں تغیر و تبدل کریں اور شاہ صاحب کا بھی جمہور علماء کی طرح یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم (جس کا ماخذ خود قرآن ہے) کے اصولوں میں تو کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ہاں فروعات میں زمان و مکان اور حالات کے مطابق اجتہاد ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن و سنت کی حدود میں رہ کر کوئی مجتہد بھی ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون۔

ترجمہ۔ یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو کوئی حدود اللہ سے تجاوز کرے گا وہی ظالم ہوگا۔

آپ لکھتے ہیں کہ "شریعت محمدی کا بھی اصل ماخذ قبل از اسلام عربوں کے رسم و رواج ہیں"

تو جناب عربوں میں تو دختر کشی کا رواج تھا بیٹی کو زندہ درگور کر دینے کی عادت تھی۔ کیا شریعت محمدی میں اس کی اجازت ہے؟ بلکہ حکم ربانی ہے:۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق۔

ترجمہ۔ اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقھم وایاکم

ترجمہ۔ ہم تمہیں اور ان کو رزق دینے والے ہیں۔

ان قتلھم کان خطأً کبیرا۔

ترجمہ۔ بے شک ان کا قتل گناہ کبیرہ ہے۔

لیکن آج ہمیں خاندانی منصوبہ بندی کو جائز قرار دینے کے لئے لامحالہ اس حکم امتناعی میں تبدیلی کرنا پڑے گی تاکہ سرے سے ہی حکم عدولی سے نجات ملے۔ پھر ہم پڑھیں گے اقتلوا اولادکم۔ پھر کیا ہم پر بھی وہی فرد جرم عائد نہ ہوگی۔ جو یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ

کیونکہ تثلیث کا عقیدہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو نہیں سکھایا نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی کی سزا منہ کالا کر کے شہر میں پھرانا تھی۔ بلکہ سنگسار کرنے کی سزا تھی۔ لیکن بدلے ہوئے حالات تو ہم سے زبردست تقاضا کرتے ہیں کہ ہم خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر کے آبادی کو کم کریں۔ پھر تو قرآن کی اس آیت کو بھی نعوذ باللہ منسوخ کرنا پڑے گا جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زمین پر ہر چلنے والے یعنی ذی روح کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِی الاَرضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزقُھَا

کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر تو ہمارا ایمان نہیں رہے گا۔ ہم خود ہی رزاق ہوں گے۔ پھر تو الحمد للہ رب العالمین کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ کیونکہ ربوبیت میں تو پرورش بھی شامل ہے جب ہم خود ہی اپنے رازق ہیں تو پھر رب کی کیا حاجت ہے۔ پھر آپ ہی بتائیں خاں صاحب! یہ سلسلہ دراز کہاں جا کے رکے گا؟ آپ اگر بدلے ہوئے حالات کے مطابق اصولوں میں بھی تغیر و تبدل کرنے بیٹھ گئے۔ اجتہاد کی قینچی لے کر تو پھر کوئی چیز سلامت رہے گی؟ پھر تو نئی شریعت اور نئے قرآن کی ضرورت پڑے گی اور لا محالہ نیا نبی بھی ضروری ہو گا۔ اور اب کہنے والے کہہ رہے ہیں۔ واقعی "نئے پاکستان" میں سب کچھ نیا ہی ہونا چاہئے بلکہ نرالا ہونا چاہئے۔

یا للعجب ــ یہ اسلام کی نہیں مرزائیت اور یہودیت کی ترجمانی ہے۔

جناب غیاث الرحمٰن صاحب

سوویت جانے والے طالب علموں کے نام

اس مضمون کے ذریعہ میں ان طالب علموں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو سوویت یونین تعلیم یا سیاحت یا یوتھ فیسٹیولوں میں شرکت کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم نظام کے مظاہرہ کے ساتھ اشتراکی نظام کی اشاعت ہوتی ہے۔ زیادہ تر ایسے پروگراموں میں ممالک اور دنیا کے نمائندے مدعو کئے جاتے ہیں جنہیں سوویت یونین کے اسکالرشپ کی بنیاد پر مختلف تعلیمی شعبوں میں مزید تعلیم کے لئے بلایا جاتا ہے۔ اور جن کی ضرورت شدت کے ساتھ ان کے ملک کی ترقی کے لئے ہوتی ہے۔ یہ ملک انہیں جدید قسم کی تجربہ گاہیں، اعلیٰ ادارے اور دیگر سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ جو انہیں اپنے ملک میں نصیب نہیں ہوتی۔ مزید تعلیم کے پس پردہ اشتراکی نظام کا پروپیگنڈہ اور تربیت کی جاتی ہے۔ جو ان ذہین طالب علموں کے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ تاکہ یہ اپنے ملک میں ان کے ایجنٹ بن سکیں بدنصیبی سے یہ ذہین طالب علم زیادہ تر نسلی امتیاز، عصبیت، حتیٰ کہ بسا اوقات بربریت کا شکار ہو جاتے ہیں اور انہیں قید بامشقت کی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ یہ طلبا آخر میں K.G.B کے ظلم و بربریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ارون کے منتخب طلباء میں سے ایک میں بھی تھا۔ جس نے آٹھ سال اس ملک کے اونچے ادارے میں تعلیم حاصل کی اور ایک سال انتہائی تکلیف دہ زندگی جو کسی حیوانی طرز سے کم نہ تھی K.G.B کے قید خانے میں گذاری۔ K.G.B ایک سراغ رساں ایجنسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے تجربات و تاثرات آپ کے سامنے پیش کردوں جو اس ملک کی حقیقت اور خوش گمانی کو فاش کردے۔ ممکن ہے آپ سوویت یونین کے پروپیگنڈہ کے شکار ہوں جو کسی طرح ہٹلر کے جارحانہ عمل سے کم نہیں ہے۔ سوویت حکومت کی زندگی حقیقت سے بہت دور عیاری اور مکاری پر مبنی ہے۔ مشرق و مغرب کے نقطہ نظر سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس وقت میرا مقصد صرف ان تجربات کو پیش کرنا ہے۔ جو ان طالب علموں کو تعلیم کے دوران پیش آتے ہیں۔

اردن کی وزارت تعلیم کی طرف سے زراعت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے میں لینن گراڈ کے اعلیٰ ادارے میں بھیجا گیا۔ میرے والدین مسلمان ہیں اور اسلام کے شدت سے حامی ہیں۔ اس ملک کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے لیکن لیکن اپنے مالی فقدان کی وجہ سے وہ مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے سے نہیں روک سکے۔

۱۹۸۱ء میں مجھے لینن گراڈ سے ایم اے کی سند ملی اور میں گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد ڈاکٹریٹ کے لئے جب دوبارہ حاضر ہوا تو میرے چند احباب نے کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کی دعوت دی تاکہ جب میں واپس گھر جاؤں تو اس نظام فکر کو اپنے ملک میں پھیلاؤں۔ لیکن میں نے اس اپیل کی شدت سے مخالفت کی۔ درخواست کرنے والوں میں جارڈن اور دوسرے غیر ممالک کے طلبہ بھی تھے۔ کبھی کبھی میرے ساتھ ان کی سیاسی جھڑپ بھی ہو جاتی تھی جو اس ملک کے اوپر سخت تنقید کے ساتھ ختم ہوتی تھی۔ جب ان حالات کی خبر K.G.B کو دے دی جاتی تھی۔ یہ باتیں مجھے اس وقت معلوم ہوئیں جب K.G.B نے مجھ سے پوچھ پاچھ شروع کر دی۔ متواتر مجھ سے اشتراکیت میں شمولیت کے لئے اصرار کیا۔ اور مجبور کیا گیا کہ غیر ملکی طلبہ کے درمیان تقریر کروں۔ یہ تقریر میرے بجائے سوویت کے تعلیم کے ذریعہ تیار کی جاتی تھی۔ دو یا تین دفعہ کے بعد میں نے تقریر سے انکار کر دیا۔ یہ تقریر زیادہ تر اسلام اور جارڈن کے اوپر فحش کلمات پر مبنی ہوتی تھی۔ لیکن مجھے ذرا بھی یہ دیر نہیں لگی کہ میں اپنے خیالات کے اظہار میں گرفتار کر لیا جاؤں میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کی تھیسس ۱۹۸۴ء کے آغاز میں جمع کر دی۔ مجھے امید تھی کہ تین ماہ کے اندر اندر سند دے دی جائے گی۔ لیکن میرے لئے وہ دن بہت تعجب خیز ہوا جب میں ۱۹۸۴ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ میری گرفتاری کی نوعیت اتنی پُراسرار تھی کہ دو دن کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ میں گرفتار کر لیا گیا ہوں۔

ایک سوویت افسر میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور بغیر تعارف کے مجھ سے درخواست کی کہ تیس منٹ کے ان کے ہمراہ VISA OFFICE چلیں۔ لیکن بجائے VISA OFFICE جانے کے ہم لوگ ایک K.G.B کی عمارت میں داخل ہوئے۔ وہاں چند آفیسر نے مجھ سے اور میری تعلیم کے سلسلے میں کچھ سوالات کئے۔ اس کے بعد پہلا شخص مجھے دوسری عمارت میں لے گیا۔ جہاں اس نے ایک پوچھ تاچھ کرنے والے آفیسر سے ملایا۔ اس نے مجھ سے صرف دو باتیں پوچھیں اس کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی۔ اس کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار بے صبری کے نشانات اور اعصاب میں تناؤ کبھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ یہ شخص اپنے فن میں ماہر تھا۔ بحث کے درمیان مجھ سے سائنس، فلسفہ، مذہب اور سیاست پر کئی سوالات کئے۔ اس وقت تک میں ان چیزوں کو صرف اوپری سطح تک سوچتا رہا۔ میں نے سوالات اور بحث کے بعد جانے کی اجازت طلب کی۔ لیکن انہوں نے مزید تفتیش کے لئے چند منٹ روک لیا لیکن جب پہلا افسر واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ دوسری صبح تک رکیں تاکہ مزید کارروائی کی جا سکے۔ جب میں نے اعتراض کیا تو اس نے مجھے دوسرے افسر سے ملنے کے لئے کہا۔ جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن مجھے زیادہ دیر نہیں لگی کہ میں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے قید خانے میں

پایا۔ جو تنگ و تاریک تھا۔ اس کے باوجود مجھے یقین نہیں آیا کہ میں قید کر لیا گیا ہوں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا کوئی جرم نہیں ہے۔

دوسرے دن دوسرے B.G.K افسر نے مجھ سے مانوس طور پر چند سوالات کئے۔ اور مجھے مدد کرنے کے لئے یقین دلایا جب اس نے سوالات کا سلسلہ ختم کیا تو ایک خط بینن گارڈ کے جج کی طرف سے مجھے دیا جس میں صرف یہ بات درج تھی کہ میں زیر معائنہ ہوں۔

اس نے مجھے دستخط کرنے کو کہا میں نے دستخط کر دیا۔ اس کے بعد میرے سامان اور کپڑے ضبط کر لئے گئے اور میں دوبارہ تنگ و تاریک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ یہاں میں نے بھوک پیاس کی سرد راتیں گذاریں جب کہ درجہ حرارت F ۱۰۵ تک پہنچ گیا تھا۔ تیسرے دن سوویت یونین کے آفیسر نے مجھ سے پوچھ تاچھ کی اور پہلی بار غذا بھی دی اور یقین دلایا کہ جلد ہی رہا کر دیا جائے گا۔ لیکن تین چار روز تک تفتیش جاری رہی۔ اور میں ایک فوجی کار کے ذریعہ ایک قید خانہ میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں میری تلاشی کر کے ایک تاریک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ اور آٹھ ماہ اس قید خانہ میں رہا جہاں میری ملاقات دوسرے غیر ملکی قیدی افغان۔ نائجیریا اور فلسطین اور انگولہ کے طلبہ تھے۔

دو ماہ بعد وہی فوجی افسر دوبارہ میرے پاس آیا۔ اور چند کاغذات دئے۔ جو مجھ پر عائد جرم کی تصدیق کر رہے تھے۔ لیکن میں نے شدت سے ان تمام چیزوں کا انکار کیا۔ ایک ماہ بعد ایک عورت افسر میرے پاس آئی اور متعدد سوالات کئے۔ مزید دو ماہ بعد ایک کاغذ وصول کیا۔ جس میں ٹرائل کی تاریخ درج تھی۔ میں نے فوراً محسوس کیا کہ سوویت یونین کے آئین کے مطابق میں اپنے حقوق کی فرمائش کروں۔ میں نے فوراً ایک خط قید خانہ کے ذمہ داروں کو لکھا۔ کہ میں جارڈن کے سفارت خانہ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ میں اپنی پسند کی بنیاد پر اپنا وکیل کر سکوں اور اپنا احتجاج اقوام متحدہ تک میں نے روانہ کیا۔ لیکن قید خانہ کے وارڈن نے جواب دیا۔ کہ میں اپنے تمام کاغذات بیت الخلاء میں پھینک دوں۔

اس سارے ردعمل کے بعد میں نے بھوک ہڑتال کا ارادہ کیا۔ اور کئی دن فاقہ کے بعد میں ایک خالی کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں میں ایک عرصہ تک بے ہوش رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے ٹیوب کے ذریعہ میرے پیٹ میں رقیق غذا پہنچائی گئی۔

پانچ ماہ قید میں گذارنے کے بعد میری ملاقات کورٹ کے ذریعہ نامزد کئے گئے وکیل سے ہوئی۔ جس نے مجھ سے وہی سوالات کئے جو مجھ سے تفتیش کے دوران کئے گئے تھے۔ سوالات کے آخر میں اس نے مجھے یقین دلایا کہ مجھے کورٹ میں حاضر نہیں ہونا پڑے گا۔ اور میں نے اپنے چند خطوط سوویت یونین اور جارڈن میں رہنے والے احباب تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے چند خطوط اسے دئے لیکن بعد میں اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں کورٹ میں حاضر ہوں۔ اور میرے خطوط کو اس نے سامنے یہ کہتے ہوئے کہ کہیں یہ خط B.G.K کے ہاتھ نہ لگ جائے

فوراً دو ٹکڑے کر دئے۔

۱۱ر جولائی کی صبح کو میں سوویت کورٹ میں داخل ہوا۔ جج نے میرے متعلق میرے الزامات کو میرے سامنے پڑھا جو بے بنیاد تھے۔ میں نے ان الزامات کا انکار کیا۔ جج نے چند اشخاص کے نام بتائے جن کے ساتھ برا سلوک کرنے کا الزام تھا۔ میں نہ انہیں جانتا تھا اور نہ ان کا نام سنا تھا۔ صرف میری ایک دوست لڑکی تھی جس سے میں واقف تھا۔ ان سارے حضرات کو کورٹ میں حاضر ہونے کی گذارش کی۔

جج نے کہا یہ سارے لوگ یہاں سے بہت دور رہتے ہیں۔ اور یہاں نہیں اس کے اور پورے ٹرائل کے درمیان جو کئی ماہ چلیں گے۔ مجھے اس قیدخانہ میں رہنا پڑے گا۔ جہاں میں بہت زیادہ مایوس ہو چکا تھا۔ ان سارے حالات کو دیکھ کر میں فوراً ٹرائل کے لئے تیار ہوگیا۔ ٹرائل کے بعد مجھے چھ سال کی بامشقت سزا سنائی گئی۔

میری ایک رشین گرل فرینڈ بھی کورٹ میں موجود تھی۔ اسے بھی میری مدافعت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ صرف خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ دو مہینے اس قیدخانہ کے قیام کے بعد مجھے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا جہاں میں نے بامشقت قید کی سزا گذاری۔ ہر قیدی کو جاتے وقت نمکین مچھلی (Salted fish) دیا جاتا تھا۔ کہ اس کی بُو سے بھاگنے والے قیدی تربیت یافتہ کتے کے ذریعے گرفتار کر لئے جائیں۔

کیمپ کے اندر کے ساتھی قیدی مختلف ممالک کے رہنے والے تھے۔ جس میں زیادہ تر عرب شام، فلسطین جارڈن اور جنوبی یمن کے باشندے تھے۔ ہر ایک کی کہانی دردناک اور المناک تھی۔ ہم لوگوں کو بامشقت زندگی گذارنی ہوتی تھی۔ جن میں پتھر کاٹنا، شیشہ تراشنا، عمارتی سامان کی تیاری وغیرہ۔ غذا بہت قلیل ملتی تھی جس سے میرا وزن دن بدن کم ہو رہا تھا۔ جو قیدی کیمپ کے ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ان کی سزاؤں میں اضافہ کر دیا جاتا۔ اور کسی تنگ کمرے میں ڈال دیا جاتا یا کسی سرد ٹب میں ڈال دیا جاتا جس میں کافی سرد پانی ہوتا۔ بعض اوقات قیدیوں کو بالو سے بھرے بورے کو پیٹھ پر لاد کر کسی اونچے پہاڑ کی مسافت طے کرنی پڑتی۔ لہٰذا وہ بری طرح تھک کر بیہوش ہو جاتے۔ اور کبھی پلاسٹک کے تھیلوں میں بند کر دیا جاتا۔ جس سے آکسیجن کے فقدان کی وجہ سے بیہوش ہو جاتے تھے۔ طبی امداد بالکل نہیں ملتی جس کی وجہ سے ہر قیدی مختلف مہلک امراض میں مبتلا ہو جاتا۔

ان قیدیوں کو بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ صرف ایک بار میں نے کورین قیدیوں کو بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا جنہیں کیمپ کے محافظ کتوں نے پکڑ لیا۔ میں اس قیدخانے سے ایک سال بعد رہا ہوا۔ اور ماسکو لے جایا گیا۔ جہاں میں نے جارڈن واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جنہوں نے میرے اچانک غائب ہو جانے کی روداد سنی تھی۔ انہوں نے جارڈن کی حکومت پر دباؤ ڈالا۔ اگر میری حکومت یہ دباؤ نہ ڈالتی تو شاید میری

رہائی نہ ہوتی۔ اور شاید میں اس کیمپ سے زندہ واپس نہ آتا۔

اب میرے زیادہ تر اوقات کیست اور ریاغ میں گذرتے ہیں۔ ہر ہفتہ میری حاضری جارڈن سفارت خانہ میں ہوتی۔ جہاں میں اپنے سامان کی واپسی جو میری گرفتاری کے بعد میرے کمرے میں رہ گئی تھی۔ اس کی فرمائش کرتا ہوں۔ ساتھ ساتھ میری سند ایم اے کی مجھ کو اب تک نہیں ملی تھی۔ لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ K.G.B میری Academy کو دباؤ ڈالے کہ وہ میری سند واپس کردے۔ سوویت نظام تعلیم میں سند کے ساتھ ساتھ یہ شرائط ضروری ہیں کہ Communist Party کا ایک آلہ بن جاؤں لیکن اس ریاکاری اور مکاری اپنی قوم کے ساتھ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سوویت حکام نے وہ سارے فوائد سوخت کردے۔ کاش حالات اور نظام کا علم قبل سے ہوتا۔

اب میری سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ میں ان لوگوں کو آگاہ کردوں جو سوویت نظام تعلیم پر مبنی وظائف (Free Scholarship) کے لئے جانے کے خواہشمند ہیں۔ ان سے میں صرف یہ کہوں گا کہ مجھے اس کی بہت قیمت ادا کرنی پڑی ۔

بقیہ فضیلت صحابہ از ص ۵۶

شرائع کے مکلف نہیں۔ لیکن قطب مدار کے مذہب پر ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی اطاعت پر کوئی جزا نہیں۔ صرف اہل اطاعت کے ساتھ اطاعت میں موافقت کرتے ہیں۔ اور عبادت کی صورت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ولایت کے کمالات فقہ شافعی کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں۔ اور نبوت کے کمالات فقہ حنفی کے ساتھ موافقت رکھتے ہیں۔ اس وقت حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہ العزیز کے اس کلام کی حقیقت معلوم ہوئی کہ حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نزول کے بعد حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق عمل کریں گے ۔

بقیہ تبصرہ کتب از صفحہ ۶۷

عبدالحق مدظلہ کے افتتاحیہ اور قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب کے مقدمہ سے کتاب کی ثقاہت و افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ باری تعالیٰ حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرماوے۔ اور اسلامیان ملت کو استفادہ و مطالعہ اور زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرماوے اور خدا کرے کہ اسلام کی نشاط ثانیہ کے اس دور میں یہ کتاب ایک فعال محرک اور انقلاب آفریں پیغام ثابت ہو۔

ماسٹر محمد عمر صاحب جہان گڑھ

فضیلتِ صحابہؓ

مجدد الف ثانی کی نظروں میں

بے شک بدنوں کے قرب کا دلوں کے قرب پر بہت اثر پڑتا ہے۔

لہذا کوئی غیر صحابی ولی حضرات صحابہ کرام رضؓ کے ادنیٰ مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ باوجود بڑی شان کے حضرت خیر البشر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت کا شرف حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو بھی نہ پا سکے۔

کسی شخص نے حضرت عبد اللہ بن مبارک سے دریافت کیا کہ حضرت امیر معاویہ رضؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحؒ میں سے کون افضل ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ وہ غبار جو حضرت امیر معاویہؓ کے سواری کے گھوڑے کی ناک میں اس وقت داخل ہوا جب حضرت امیر معاویہ رضؓ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر جہاد میں تھے۔ وہ (غبار) حضرت عمر بن عبد العزیز رحؒ سے ہزار درجہ بہتر ہے (مکتوب ۲۰۷۔ دفتر اول)

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کرنے والے حضرت وحشیؓ جو ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت میں پہنچے ہیں۔ حضرت خیر التابعین اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے بہتر ہیں۔

منازعات صحابہؓ اصحاب کرام رضوان اللہ اجمعین کے باہمی جدال ان پر چھوڑو۔ اور تم اپنی طرف سے کوئی رائے قائم نہ کرو۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا یہ وہ خون ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہاتھوں کو پاک رکھا۔ ہم اپنی زبانوں کو اُن سے پاک رکھیں۔

حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی محبت اہل سنت والجماعت کی شرط ہے اور جو شخص یہ محبت نہیں رکھتا وہ جماعت حقہ اہل سنت والجماعت سے خارج ہے اور وہ خارجی ہے۔ اور جو شخص اس محبت میں افراط و تفریط اختیار کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو سب و شتم کرتا ہے وہ صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے طریقے کے برخلاف چلتا ہے۔ اسے رافضی کہتے ہیں۔

خارجیوں کا حال یہودیوں کی طرح ہے۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر تہمت لگائی اور رافضیوں

کا حال نصاریٰ کا سا ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محبت کے غلو میں ابن اللہ کہہ دیا۔ خارجی اہلبیت کی عداوت اور آلِ نبی کے بُغض سے خوش ہوتے ہیں۔ اور رافضی اہلبیت کی محبت اور صحابہ کرام کے حق میں بدظن ہو کر سب وشتم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ لہٰذا دونوں گروہوں کا حشر یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہو گا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

اذا ذکر اصحابی فامسکو جب میرے صحابہ کا ذکر آئے تو اپنی زبان کو سنبھال کر رکھو۔ کیونکہ اصحابہ کلہم عدول۔ تمام صحابہ عادل ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر حضر جہاد عبادات میں آپ کے ساتھ تھے اور وحی الٰہی کے عین شاہد ہیں۔ اس لئے حضرات صحابہ رضوان اللہ اجمعین کی محبت دینِ حق کی محبت کی دلیل ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سب کے سب بزرگ ہیں۔ ان سب کو بزرگی اور فضیلت کے ساتھ یاد کرنا چاہیئے۔ حضرت خطیبؒ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پسند فرمایا تو میرے لئے میرے اصحاب کو بھی پسند فرمایا۔ ان میں سے بعض کو میرے رشتہ دار اور مددگار پسند فرمائے۔ اور ان کے حق میں جس سے محفوظ فرمایا اسے اللہ نے محفوظ کیا اور جس نے ان کے حق میں مجھے ایذا دی اس نے میرے اللہ کو ایذا دی۔ اور جو میرے اصحاب کے ساتھ محبت رکھتا ہے میری ہی وجہ سے رکھتا ہے۔ اور جو بُغض کرتا ہے وہ میری وجہ سے بُغض کرتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ امت میں بُرے لوگ وہ ہیں جو آپ کے اصحاب پر دلیر ہیں۔

طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے میرے اصحاب کو گالی دی اس پہ اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں کی لعنت ہے۔ امام مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی کسی صحابی کو کوئی شخص گالی دے تو اس کا حکم شرعی قتل یا پھانسی ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوتی ہے اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا مقبول الدعوات کون ہو سکتا ہے؟ آپؐ فرماتے ہیں:۔

"اے اللہ معاویہ کو کتاب حساب سکھا اور عذاب سے محفوظ فرما" اور دوسری دعا میں فرمایا:۔

"اے اللہ اس کو تو ہادی و مہدی بنا"

عاشق صادق کو چاہیئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کو دوست رکھے اور حضور کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھے۔

فضیلت شیخین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین | ایک دن کسی شخص نے بیان کیا کہ لکھا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کا نام بہشت کے دروازے پر لکھا ہوا ہو گا۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ حضرات شیخین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے ان کے مقام کی کیا خصوصیت ہو گی منکشف ہوا کہ :

" داخلہ بہ این بہشت بہ استصواب ابوبکر و عمر است "، بہشت میں اس امت کا داخلہ ان دو اکابر کی رائے اور تجویز کے بغیر نہیں ہو گا۔ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہشت کے دروازے پر کھڑے ہیں اور لوگوں کے داخل ہونے کی تجویز فرماتے ہیں۔ حضرت سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امتی کا ہاتھ پکڑ کر بہشت میں لے جاتے ہیں۔ ایسا شہود ہوتا ہے جیسے تمام بہشت حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نور سے لبریز ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

" لو کان بعدی نبی لکان عمر "۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رض کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ ابن عمر رض نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی مجلس میں فرمایا۔ آج عمر رض کی شہادت کے بعد نو حصے علم اٹھ گیا۔ اور اس کی مزید تشریح کے بعد فرمایا۔ کہ میری مراد علم سے علم باللہ ہے۔ نہ کہ علم حیض و نفاس۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ مہاجرین و انصار و السابقین و الاولین رض اپنے درمیان عمر کے اس امتیاز پر متفق تھے کہ ان کی زبان پر سکینہ بولتا ہے۔ حضرات شیخین موت کے بعد بھی جدا نہیں ہوئے۔ اور ان کا حشر بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گا۔ تابعین اولیاء امت نے کشف صحیح کے نور و اخبار صادقہ و اخبار کاملہ سے شیخین کے کمالات کو دریافت کیا ہے۔ اور ان کے فرائض کو جان کر ان کے افضل ہونے کا متفقہ فیصلہ کیا ہے۔ اور اس پر تمام کا اجماع ہے۔ ان کے بعد کے اولیاء کا جو کشف ہو گا اگر اکابر کی رائے کے خلاف ہو گا اسے قابل رد کر دیں گے۔ اور ایسے کشف کا کوئی اعتبار نہیں۔

امام بخاری نے ابن عمر رض سے روایت کی ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حین حیات میں بھی کسی کو ابوبکر اور پھر عمر اور پھر عثمان کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ پھر آپ کے اصحاب میں سے کسی کو ایک دوسرے پر ترجیح اور فضیلت نہیں دیتے تھے۔

مسلک حنفی کی جامعیت | آج صبح کے حلقے میں حضرت الیاس اور حضرت خضر علی نبینا علیہ السلام کو روحانی صورت میں دیکھا تشریف لائے۔ روحانی ملاقات میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم عالم ارواح سے ہیں۔ ہماری ارواح کو حرکات و سکنات جسمی عبادات وغیرہ ہماری روحوں سے وقوع پذیر ہوتی ہیں ہم

(بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

قارئین بنام مدیر

افکار و تاثرات

۱۹۷۳ء کا آئین | ایک اخباری بیان میں چند بزرگوں کے حوالہ سے یہ مژدہ جانفزا سن کر خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بھی اسلام کی حفاظت کی ضمانت موجود ہے۔ اب تو ہمیں اپنے ذوقِ مطالعہ کی کمی کا اعتراف برملا کرنا چاہیئے۔ اگر سوءِ اتفاق سے اس دن اخبار نہ پڑھتے تو اب تک اندھیرے میں رہتے۔ اور خواہ مخواہ شریعت بل کے لیے دوڑ دھوپ کر کے اپنے آپ کو مفت میں تھکا دیتے۔ اب تو ہمیں چھٹی مل گئی، ۷۳ء کا آئین بحال ہو چکا ہے اور خود کار آلات سے خود بخود اسلام کی حفاظت ہوتی رہے گی۔

پچھلے سالوں میں ہم سے بہت بڑی غلطی یہ سرزد ہو گئی ہے کہ ہم نے ۷۳ء کے آئین کو کاغذ کے صفحات کے بجائے اس کے نافذ کرنے والوں کے گفتار اور کردار کے حوالہ سے ان کے چہروں میں پڑھا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں تہہ بہ تہہ اندھیروں میں روشنی کی کرن نظر نہیں آئی۔ اس آئین کے خالق کی زبان سے نشہ کی حالت میں ہم نے سنا کہ:

"میں زیادہ نہیں پیتا، بس تھوڑی سی پیتا ہوں"۔ اور یہ بھی سنا کہ "ہاں شراب پیتا ہوں خون نہیں پیتا"۔ اور یہ بھی کہ "اگر میں شراب پیتا ہوں تو کیا ہوا؟ فلاں صاحب بھی تو حلوہ کھاتا ہے"۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے ہمنوا بزرگ فتویٰ دیں کہ حالتِ سُکر میں سب کچھ جائز ہے لیکن ہم جیسے کل کے بچے اس قسم کا فتویٰ نہیں دے سکتے۔ پھر ہم نے اس آئین کے بنانے والے کی سینہ زوری بھی دیکھ لی کہ وہ ایک عالمِ دین کو اٹھوا کر اسمبلی سے باہر پھینک دیتا ہے اور یہ بھی اس چشمِ بدبخت نے دیکھ لیا کہ ایک نوجوان خادمِ دین شمس الدین کے خون سے اس ظالم کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ ہم نے پنجاب کے ایک گورنر بہادر کی بہادری بھی دیکھ لی۔ کہ وہ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اغوا کر کے گورنر ہاؤس میں بٹھا دیتا ہے اور یوں عملاً گورنر ہاؤس کو قحبہ خانہ بناتا ہے۔ اور سرحد کے وزراء کو نوجوان مسلمان طلباء کے ہاتھوں پٹتے ہوئے بھی دیکھا کہ انہوں نے وزارت کو غنیمت جان کر ایک طالبہ کی عصمت پر ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے اس وقت کے وزیرِ مذہبی امور کو سائنٹیفک سوشلزم اور مارکسزم کی بات کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ان تاریک چہروں کو دیکھ کر ہم نے آئین پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جس کی وجہ سے ہم غلط فہمی کا شکار رہے۔ اور اب بحمداللہ یہ بات منکشف ہو گئی ہے کہ ۷۳ء کے آئین میں اسلام کی حفاظت کی ضمانت موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مرد کے ہوتے ہوئے اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی اس کے لئے ایک خاتون کی ضرورت ہے جو میدانِ عمل میں

کو دیتی ہے۔ چونکہ ہم نے اس آئین کو نہیں پڑھا اور ہم اپنی کم علمی کا اعتراف بھی کرتے ہیں اس لئے محض آپ کو سمجھانے کی خاطر ان بزرگوں سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا ۱۹۷۳ء کا آئین کسی خاتون کو ایسی پارٹی کا سربراہ بننے کی اجازت دیتا ہے جس میں اکثریت مردوں کی ہو۔ اور کیا وہ کسی خاتون کو مردوں کے جھگڑوں میں گھسنے کی اجازت دیتا ہے اور کیا وہ مردوں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں اور اتنی بڑی اور اہم ذمہ داری کا بوجھ ایک بیچاری خاتون کے نازک کندھوں پر لاد دیں۔ اگر وہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور یقیناً نہیں دے گا۔ کہ وہ اتنا اسلامی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے شریعت بل کی ضرورت نہیں۔ تو پھر ان بزرگوں کو چاہئے کہ وہ اس خاتون کو ۱۹۷۳ء کے آئین کا پابند بنا کر اس کا تقدس بحال کریں اور اگر ان بزرگوں کے کہنے کے باوجود بھی اس آئین میں اس قسم کی اجازت ہے تو پھر ہم صاف صاف کہتے ہیں۔ کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے یہ بزرگ فوراً فرما دیں کہ اس خاتون کے ساتھ ہمارا کیا تعلق جو ہم ان کو پابند بنا سکیں۔ تو اتنا ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ ان کو پابند نہیں بنا سکتے البتہ تعلق سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ آپ ایم آر ڈی میں شامل ہیں۔ ایم آر ڈی کی اصل اور حقیقی سربراہ پیپلز پارٹی ہے۔ اور پیپلز پارٹی کی سربراہ یہی خاتون ہیں۔ اسی ہی خاتون کی سحر آفرینی ہے کہ آپ جیسے لوگ بھی شریعت بل کی مخالفت کرتے ہیں۔ آپ غالی شیعوں کے بارے میں بھی مُہر بہ لب ہیں اس لئے کہ اس خاتون کی ماں شیعہ ہیں۔ اور خود اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ باپ کے مسلک پر ہے یا ماں کے۔ آپ ان لوگوں کے بارے میں بھی خاموش ہیں جنہوں نے قرآنی احکامات کا مذاق اڑایا۔ آپ نے ان عورتوں کے بارے میں کچھ نہ کہا جنہوں نے بے پردہ ہو کر جلوس نکالا۔ آپ نے تصویر کو جائز کیا اور بزعم خود اپنے جلسوں اور جلوسوں کو مختلف قد آور تصویروں سے زینت بخشی۔ جب کہ اہلِ نظر دیکھتے ہیں کہ اس خلافِ شریعت حرکت سے آپ کی قد کاٹھ کتنی کم ہو گئی ہے۔ آپ نے غریب علماء کو زکوٰۃ خوری کا طعنہ دیا یہی کچھ کمیونسٹ بھی کرتے ہیں۔ اقبال نے خوب کہا تھا ؎

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

ابو عمار قریشی

مجلسِ احرار کی تاریخ | مجلسِ احرار اسلام کی سیاسی و دینی جدوجہد پر نئے زاویہ سے تحقیقی کام کے آغاز کا ارادہ ہے۔ اس سلسلہ میں جن احباب کے پاس معلومات، دستاویزات یا تصاویر ہوں وہ براہِ کرم رابطہ کریں مشکور ہوں گا۔

میجر (ریٹائرڈ) محمد طارق۔ شعبۂ تاریخ، ایچی سن کالج۔ لاہور ۳

وزارتِ تعلیم

پاکستان کے دینی مدارس کے مہتمم صاحبان متوجہ ہوں

نیشنل ایجوکیشن پالیسی کی روشنی میں حکومت پاکستان وفاقی وزارت تعلیم (اسلامک ایجوکیشن ریسرچ سیل) ملک کے دینی مدارس میں مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ میٹرک کی سطح تک دورِ حاضرہ کے جدید علوم انگریزی، معاشیات اور مطالعۂ پاکستان کی تدریس کا انتظام کرنے کی ابتداء کر چکی ہے۔ چنانچہ دس مدارس کو ان کی مرضی کے مطابق اس مقصد کے پیش نظر ایک سال کی امداد دی جا چکی ہے۔

پروگرام کے مطابق سالِ رواں میں مزید پندرہ مدارس منتخب کئے جائیں گے۔ ہر مدرسہ کے لئے دو دو اساتذہ کی تنخواہ مروّجہ پے سکیلز کے مطابق حکومت پاکستان پہلے سال پوری تنخواہ اور دوسرے سال ۷۵ فیصد تنخواہ دے گی۔

نیز متعلقہ مدارس کو انگریزی، معاشیات اور مطالعۂ پاکستان کی درسی کتابوں کے پچیس سیٹس فی مدرسہ دی جائیں گی۔ جن کی ۷۵ فیصد قیمت حکومت ادا کرے گی۔

ان دینی مدارس کے مہتمم صاحبان جو اپنے مدارس میں مذکورہ مضامین کی تدریس کے خواہشمند ہوں ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶ء سے قبل اسلامک ایجوکیشنل ریسرچ سیل وزارت تعلیم، سیکٹر ایچ ۹ اسلام آباد سے تحریری یا فون نمبر ۰۲-۸۵۶۰۰ پر رابطہ قائم کریں۔ جن دس مدارس کو اس سکیم کے تحت پہلے سے شامل کیا گیا ہے انہیں درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔

محمد حنیف
ریسرچ سکالر

PID ۱۱۰-۵٫۸۹

حکومت پاکستان
کمیونیکیشن اینڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ
نوٹس طلبی ٹینڈر

محکمہ سی اینڈ ڈبلیو صوبہ سرحد کے منظور شدہ گورنمنٹ کنٹریکٹرز سے مندرجہ ذیل کاموں کے لئے ٹینڈرز مطلوب ہیں

نمبر شمار	کام کا نام	تخمیناً لاگت	زرضمانت	ٹینڈر کھولنے کی تاریخ	میعاد تکمیل
۱۔	ضلع پشاور میں 68 پرائمری سکولوں کی تعمیر (43 برائے لڑکوں اور 25 برائے لڑکیوں)				
	سب ہیڈ	روپے	روپے		
	i) نوشہرہ کینٹ میں گورنمنٹ پرائمری سکول (بوائز)	165,000/-	3300/00	10/86	۴ ماہ
	ii) گورنمنٹ گرلز پرائمری سکول بختی	215,000/-	4300/00	ایضاً	ایضاً
2۔	ضلع پشاور کے پرائمری سکولوں میں 38 کمروں (۱۵ برائے لڑکیوں) کی تعمیر				
	سب ہیڈ				
	i) گورنمنٹ پرائمری سکول سمندر گڑھی (2 کمرے)	190,000/-	3800/00	ایضاً	ایضاً
	ii) گورنمنٹ پرائمری سکول میر کلاں (ا کمرہ)	95,000/-	1900/00	ایضاً	ایضاً

ٹینڈر فارمز جاری کروانے کے لئے درخواستیں تاریخ مقررہ سے ایک دن قبل مندرجہ ذیل معلومات کے ساتھ زیر دستخطی کو پہنچ جانی چاہیئں۔ i) ٹھیکیدار کا رجسٹرڈ شدہ نام ii) رسید تجدید فیس (فوٹوسٹیٹ کاپی) iii) زیر تکمیل کاموں کی تفصیل معہ مندرجہ ذیل معلومات۔ الف) کام کا نام ب) تخمیناً لاگت ج) کام شروع کرنے کی تاریخ د) تاریخ تکمیل ر) آج تک جتنا کام کیا ہو (تقریباً رقم)۔ ٹینڈر فارم اہل ٹھیکیداروں کو مقررہ کو صبح آٹھ بجے تا دوپہر بارہ بجے جاری کئے جائینگے۔ سیل شدہ ٹینڈر تاریخ مقررہ کو صبح گیارہ بجے وصول کئے جائینگے اور اسی دن دوپہر بارہ بجے ٹھیکیداروں یا ان کے مجاز نمائندوں کی موجودگی میں کھولے جائینگے۔ کال ڈیپازٹ کی صورت میں زرضمانت بنام ایگزیکٹیو انجینیئر بلڈنگ ڈویژن پشاور ہر ٹینڈر فارم کے ساتھ آنا چاہیئے۔ زرضمانت میں نقد رقم قبول نہیں کی جائیگی۔ مشروط، نامکمل یا بذریعہ تار ٹینڈر منظور نہیں کئے جائینگے۔ اتھارٹی مجاز کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی یا تمام ٹینڈروں کو بغیر کوئی وجہ بتائے منظور / منسوخ کرے۔ مزید تفصیلات کسی بھی کام والے اوقات کار کے دوران زیر دستخطی کے دفتر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

دستخط:۔ ظفر بیگ بیٹنی۔ ایگزیکٹیو انجینیئر بلڈنگ ڈویژن پشاور

INF (P) 2498
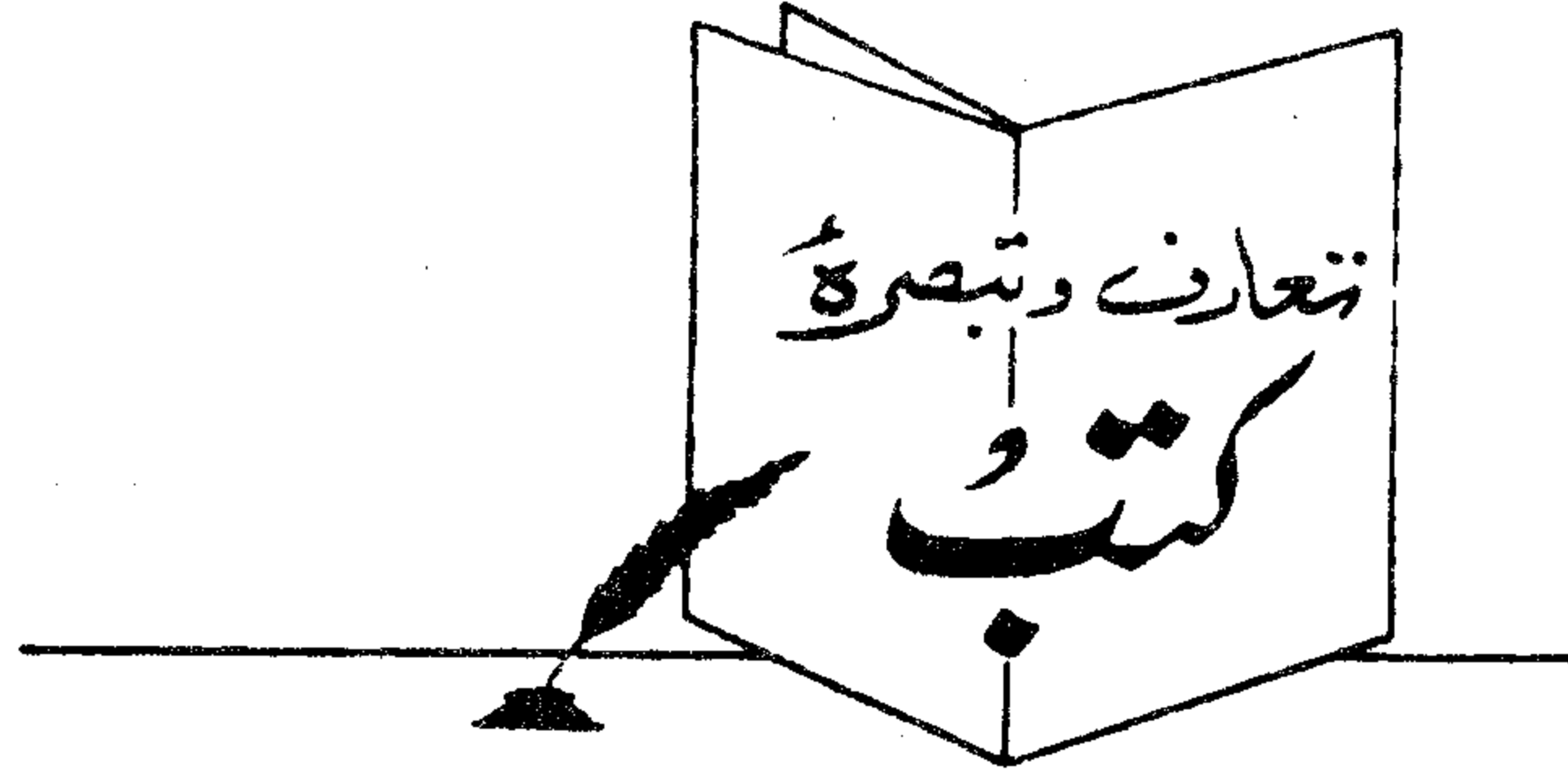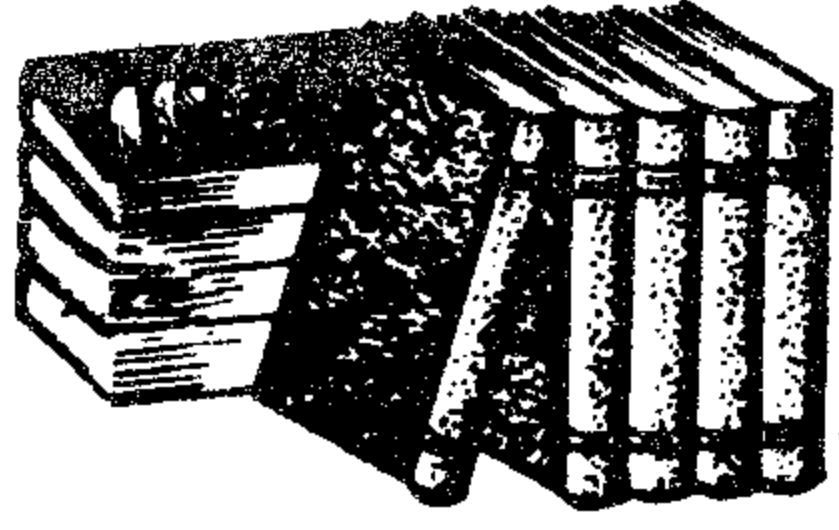
مولانا سمیع الحق

"دفاعِ امام ابوحنیفہؒ" | تصنیف: مولانا عبدالقیوم حقانی۔ صفحات ۳۵۲۔ قیمت ۴۵ روپے
پتہ:- مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک، پشاور

> دفاعِ امام ابوحنیفہ، مؤتمر المصنفین کی تازہ علمی اور تاریخی پیشکش ہے
> پیش لفظ جناب مولانا سمیع الحق مدیر الحق نے تحریر فرمایا ہے، ذیل میں وہی بطور
> تبصرہ و تعارف پیش خدمت ہے! (ادارہ)

سیدنا الامام ابوحنیفہ النعمان سوادِ اعظم اہل سنّت والجماعت کے امام فقہ و قانونِ اسلامی کی باضابطہ تدوین و تشکیل کے مدوّن اول ہیں۔ اور درحقیقت حضرت امام شافعیؒ حضرت امام مالکؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے فقہی افادات کی ترتیب اور ان کی قانونی تشکیل بھی حنفی دبستانِ فقہ کی مرہونِ منّت ہے۔ امت کے اس عظیم محسنؒ کے خلاف معاذ آرائی نت نئے الزامات، اعتراضات و اتہامات، اسلامی آئین اور شریعت کے نفاذ و ترویج میں روڑے اٹکانے، نظام شریعت کو ناقابل تنفیذ بنانے اور ناقص قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس وقت جبکہ پاکستان میں فقہ اسلامی اور شریعت کے نفاذ کا مسئلہ پھر سے موضوعِ بحث بنا ہوا ہے تمام افرادِ امت بالخصوص سوادِ اعظم اہلسنت کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ امام اعظم ابوحنیفہ کی سیرت و سوانح شخصی و قومی کردار علمی فقہی اور آئینی خدمات سیاسی حکمت و تدبر حنفی فقہ کی جامعیت، اس کی قانونی و آئینی وسعت و ہمہ گیری اور ہر دور میں "قابل نفاذ اور کامیاب نظام کے طور پر تعارف کرائیں۔ اس سلسلے میں مخالفین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات مطاعن اور شکوک و شبہات کا مدلل اور مسکت جواب دیں۔ اور مختلف فتنوں، دہریت، نیچریت، مغربیت، مادیت سرمایہ داری و اشتراکیت اور خمینیت (شیعہ ازم) کے دام تزویر میں پھنسنے والوں کے لئے تحقیق و دلیل کی شمع

جلائی جائے اور ہدایت و رہنمائی کا چراغ روشن کیا جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ دارالعلوم حقانیہ کے فاضل و مدرس عزیز گرامی قدر محب محترم و فاضل مکرم مولانا عبدالقیوم حقانی سات سال سے اس اہم اور حد درجہ محتاط موضوع پر بڑے حزم و احتیاط سے کام کرتے رہے۔ اس موضوع کے متعلق ان کے تحقیقی مضامین اور گراں قدر مقالات ماہنامہ الحق اور ملک و بیرون ملک اہم علمی و دینی جرائد میں شائع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

الحمدللہ کہ حالات کے تقاضوں، وقت کی ضرورت، ملکی سیاست اور بین الاقوامی سطح پر عام انسانوں میں اسلام کے لئے تڑپ امن و سکون اور نجات و فلاح کے ضامن مذہب و آئین کی تلاش میں جو اضطراب، ہیجان اور تجسس پایا جاتا ہے۔ موصوف کی تحقیقی اور تحریری کاوشیں ثمر آور ہو کر دفاع حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نام سے مرتب ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ جو ایک تحقیقی تصنیف اور ایک علمی و تاریخی شاہکار ہے اور اب اسے ادارہ مؤتمر المصنفین بہی خواہان ملت اور ہمدردان امت کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ یہ نبوت کا معجزہ، اسلام کی صداقت و حقانیت کی دلیل خود امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کرامت اور مولانا عبدالقیوم حقانی کا حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ سے خصوصی تلمذ والہانہ وفادارانہ تعلق عشق و محبت اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی توجہ و عنایت اور دعا کی برکت ہے۔ کہ موصوف دارالعلوم میں مختلف مشاغل ہمہ وقتی اور کثیر مصروفیات کے باوجود ایک جامع اپنے موضوع پر منفرد اور ایک معلوماتی کتاب لکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جس میں ہر طبقہ کے علم و تحقیق اور ذوق مطالعہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ قانون اور تاریخ سے مناسبت رکھنے والوں کے لئے سیرت و سوانح اور حنفی تاریخ کے حیرت انگیز واقعات، تعلیم و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کے لئے فقہائے حنفیہ کے تعلیمی علمی مطالعاتی اور تحقیقی سرگرمیاں اور کارنامے، فتاویٰ اور قضا سے تعلق رکھنے والوں کے لئے فقہ حنفیہ کے ذخائر کے چند اصول و نظائر۔

وکلاء اور قانون دان طبقہ کے لئے امام اعظم کے آئینی مساعی اور قانونی اصول و کلیات، سیاست و انقلاب کی راہ چلنے والوں کے لئے امام ابوحنیفہ اور آپ کے تلامذہ کے عظیم تحقیقی اور تصنیفی شاہکار، بحث و مناظرہ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے امام صاحب کے دلچسپ بحث و مناظرے اور حجت و استدلال مختلف فتنوں اور جدید تہذیب و معاشرت میں دینی، علمی اور تبلیغی و اصلاحی کام کرنے والوں کے لئے امام ابوحنیفہ کے وصایا اور نصائح۔ غرض انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر متعلقات، ضروریات اور اہم موضوعات پر نہایت حسن ترتیب کے ساتھ کافی اور نافع مواد جمع کر دیا گیا ہے۔

ان گوناگوں اور مختلف حیثیتوں میں شاید ہی کوئی موضوع ہو جو تشنہ رہ گیا ہو۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا

(بقیہ صفحہ ۵۴ پر)
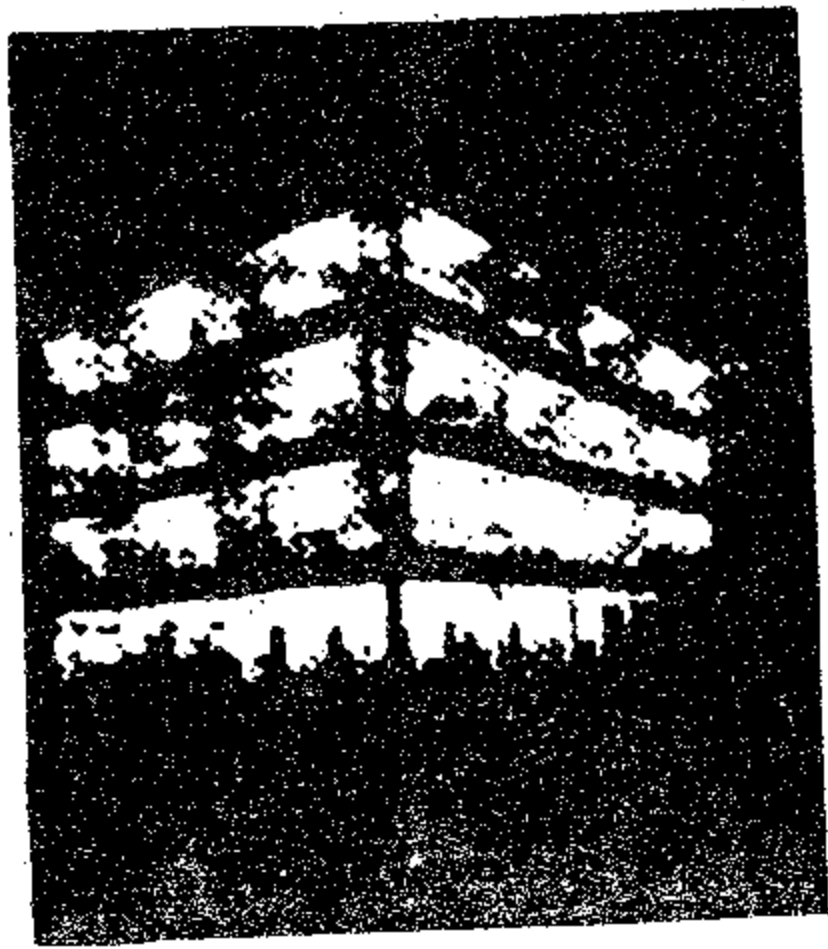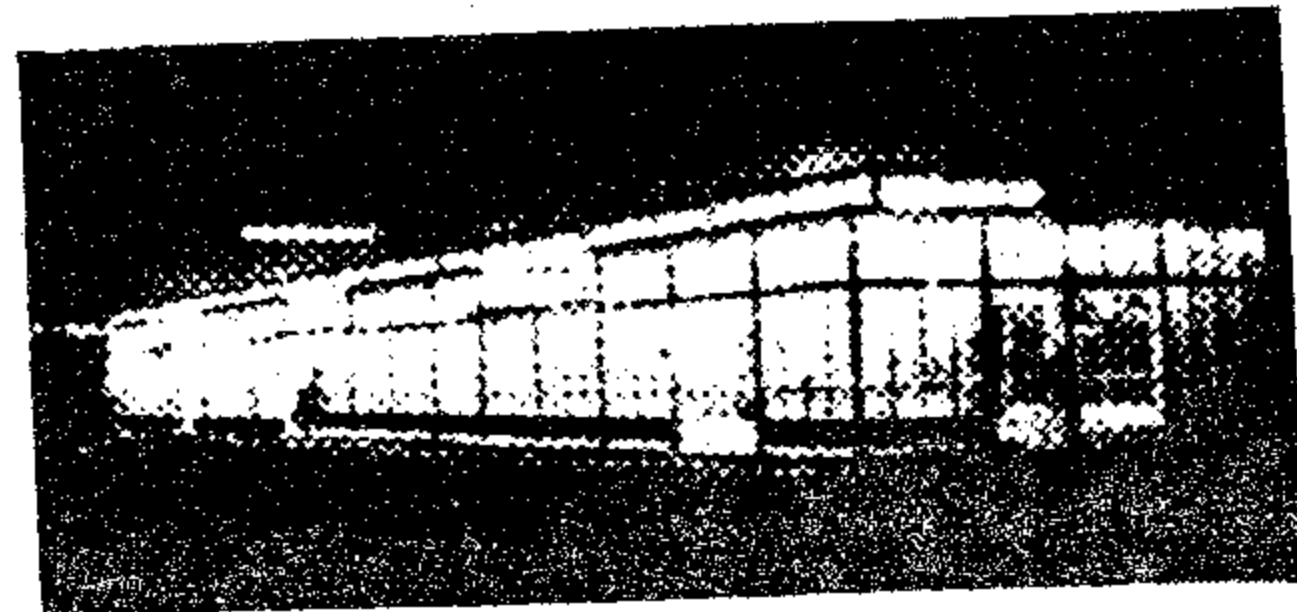
دفتر ہو، یا فیکٹری
دوکان ہو، یا گھر
شیشہ
خواجہ کا
خواجہ گلاس انڈسٹریز لمیٹڈ
شاہراہ پاکستان ــــــــ حسن ابدال
فیکٹری آفس :- ۱۰۰-بارلے اسٹریٹ صدر راولپنڈی
رجسٹرڈ آفس :- ۳-ایبٹ روڈ، لاہور